وَقَدْ أَخَذَ مِيثَاقَكُمْ إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ

ماہنامہ

میثاق

لاہور

مارچ - اپریل ۱۹۸۰ء

★

مدیر مسئول

ڈاکٹر اسرار احمد

★

یکے از مطبوعات

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

مقام اشاعت : ۳٦ - کے ، ماڈل ٹاؤن ، لاہور

(فون : 852683 - 852611)

قیمت فی شمارہ -/4

چندہ سالانہ -/۲۰

وَقَدْ اَخَذَ مِيْثَاقَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ

ماہنامہ

میثاق

لاہور

جلد ۲۹ | مارچ ۔ اپریل ۱۹۸۰ء | عدد ۳۔۴

مشمولات

★ عرض احوال — ڈاکٹر اسرار احمد — الف

★ تقدیم — ,, ,, ,, — ۱

★ قرآن حکیم کی دعائیں : تشریحی تقریر — ,, ,, ,, — ۲

★ سلسلہ نوربخشیہ : ایک وضاحت — غلام حسن نوربخشی، محمد حق نواز بلتستانی

★ یقین روح سعی و عمل : مقالہ خصوصی — ڈاکٹر اسرار احمد — ۹

★ درس سورۃ العصر — مولانا عبدالغفار حسن — ۲۵

★ دوسنون دعائیں : درس حدیث — مولانا محمد حسین میر — ۳۳

★ بیداری ضمیر کے نمونے — حافظ منظور احمد — ۴۷

★ ڈاکٹر اسرار احمد کے ساتھ بھارت میں پندرہ دن : روداد سفر — قاضی عبدالقادر — ۵۳

★ ہندوستان سے ایک خط — ڈاکٹر اخترالواسع — ۸۰

★ مولانا مودودی مرحوم کے بارے میں ڈاکٹر اسرار احمد کا ایک انٹرویو — ماہنامہ قومی ڈائجسٹ

★ حیات بعد الممات پر آثار کائنات سے استدلال — محمد یونس — ۹۷

پبلشر : ڈاکٹر اسرار احمد ★ طابع : رشید احمد چوہدری

مطبع : مکتبہ جدید پریس ' شارع فاطمہ جناح ' لاہور

ڈاکٹر اسرار احمد

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عرضِ احوال

اس بار ـــــ اوّلاً تو پیشِ نظر اشاعت کی کہانی ہی خاصی دلچسپ ہے۔ مارچ کے شمارے میں کسی قدر تاخیر تو راقم کے سفرِ ہند کے باعث ہی ہو گئی تھی۔ تاہم وہ بس اتنی ہی تھی کہ پرچہ زیادہ سے زیادہ دس مارچ تک حوالۂ ڈاک ہو جاتا۔ لیکن اس میں مزید اضافہ پریس کی مشغولیت کے باعث ہو گیا۔ اس لئے کہ وہاں کسی سرکاری کام کی لمبی داب چل رہی تھی۔ جب اس طرح معاملہ وسطِ مارچ سے بھی آگے نکل گیا تو مجبوراً یہ فیصلہ کیا گیا کہ اب اسے بھی دو ماہی اشاعت ہی بنا دیا جائے۔ چنانچہ دو مضامین کا اضافہ آخر میں اور ایک کاپی کا اضافہ شروع میں ہوا۔ یہی وجہ ہے کہ 'عرضِ احوال' پر مشتمل پہلے آٹھ صفحات کا شمار ابجد ہوّز کے حساب سے ہے اور اس کے بعد پھر صفحہ نمبر ا پر 'تقدیم' سامنے آجاتی ہے، جس سے اصلاً مارچ کی اشاعت کا آغاز ہونا تھا۔ الغرض ـ عرفت ربّی بفسخ العزائم! والا معاملہ ہے!

کچھ ایسا ہی، بلکہ اس سے بھی کسی قدر بڑھ کر معاملہ اس بار 'قرآن کانفرنس' کا ہوا۔ مرکزی انجمن خدّام القرآن لاہور کی ساتویں سالانہ قرآن کانفرنس کے بارے میں انجمن کی مجلسِ منتظمہ نے اوّلین فیصلہ ۲۱ تا ۲۴ مارچ کا کیا تھا۔ بعد میں جب یہ معلوم ہوا کہ بالکل یہی تاریخیں دارالعلوم دیوبند کے 'جشنِ صد سالہ' کی تقریبات کی ہیں اور پاکستان سے کثیر تعداد میں علماء و فضلاء اس میں شرکت کے لئے تشریف لے جائیں گے تو تاریخیں تھوڑی سی آگے بڑھا دی گئیں یعنی ۲۳ تا ۲۷ مارچ، اور اس کا اعلان بھی گذشتہ شمارے کے کور پر شائع کر دیا گیا ؛

ادھر راقم ہندوستان میں مولانا سیّد ابوالحسن علی ندوی اور مولانا محمد منظور نعمانی مُدّ ظلّہما کی خدمت میں حاضر ہوا تو دونوں بزرگوں نے مشفقانہ مشورہ دیا کہ تم

اس تاریخی اجلاس میں ضرور شرکت کرو — اور جب میں نے عرض کیا کہ یہ اجتماع تو فضلاءِ دار العلوم کا ہے اور میرا معاملہ تو زیادہ سے زیادہ ؎

أُحِبُّ الصَّالِحِينَ وَلَسْتُ مِنْهُمْ ۞ لَعَلَّ اللّٰهَ يَرْزُقُنِي صَلَاحًا

والا ہے، تو انہوں نے فرمایا کہ اس کی فکر تم مت کرو، ہم دعوت نامہ بھجوا دیں گے' چنانچہ وہ موصول بھی ہو گیا — اب ایک جانب ان بزرگوں کی یہ شفقت اور دوسری جانب علماءِ کرام سے رابطے کے اس زرّیں موقع سے فائدہ اٹھانے کی کوشش۔ فیصلہ یہی ہوا کہ اس اجتماع میں ضرور شرکت کی جائے۔ (چنانچہ ان سطور کی تحریر کے وقت راقم ہندوستان کے "بارِ دگر" سفر کے لئے بالکل پا برکاب ہے!) اور اس طرح مزید تاخیر ناگزیر ہو گئی۔ چنانچہ فیصلہ ہوا کہ کانفرنس ۴ر تا ۹ر اپریل منعقد ہو اور اس کے لئے ابتدائی اشتہار بھی روزنامہ 'نوائے وقت' میں اشاعت کے لئے بھیج دیا گیا۔ لیکن پھر اچانک معلوم ہوا کہ یکم یا دس اپریل یونیورسٹی میں تعطیلات ہوں گی، اور اس بار چونکہ کانفرنس 'قرآن اکیڈمی' میں منعقد کی جا رہی ہے' لہٰذا یونیورسٹی کے اساتذہ اور طلباء کی شمولیت لبطورِ خاص پیش نظر ہے اس لئے ایک بار پھر کانفرنس کا پروگرام مؤخر کرنا پڑا۔ اب تا حال حتمی فیصلہ یہی ہے کہ یہ کانفرنس ۱۸ر تا ۲۱ر اپریل منعقد ہو گی۔ باقی ہو گا وہی جو اللہ چاہے گا، لہٰذا اُسیٰ سے دعا ہے کہ وہ حالات کو سازگار بنا دے، اور ساتویں سالانہ قرآن کانفرنس مجوزہ تاریخوں میں اپنی سابقہ روایات کے مطابق کامیابی کے ساتھ منعقد ہو —

وما ذٰلك على الله بعزيز ۔۔۔۔۔۔۔!!

مرکزی انجمن خدّام القرآن لاہور ۱۹۷۲ء میں قائم ہوئی تھی، اور اس کے زیرِ اہتمام سالانہ قرآن کانفرنسوں کا سلسلہ ۱۹۷۳ء سے شروع ہو گیا تھا۔ تا حال چھ کانفرنسیں منعقد ہو چکی ہیں، چار لاہور میں اور دو کراچی میں، اب یہ ساتویں کانفرنس قریب الانعقاد ہے ۞

اس کا اجمالی پروگرام اس اشاعت کے کور کے صفحات پر ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔ ان شاء اللہ العزیز ۱۸ر اپریل کو دو اجلاس ہوں گے، اور دونوں وسطِ شہرِ لاہور میں ہی ہوں گے۔ پہلا نمازِ جمعہ کے بعد سے عصر کے وقت تک جامع مسجد دار السلام باغ جناح

میں اور دوسرا بعد نمازِ عشاء واپڈا آڈیٹوریم یا مسجدِ شہداء میں۔ پہلے کا عنوان حسبِ سابق "عظمت و اعجازِ قرآن!" ہوگا اور اس میں ان شاء اللہ مختلف مکاتب فکر کے چوٹی کے علماء شرکت فرمائیں گے ــ اور دوسرے کا "دستوری اور قانونی مسائل اور قرآنِ حکیم!" اور اس میں بفضلہٖ تعالیٰ و بعونہٖ ملک کے چوٹی کے ماہرینِ قانون و دستور کی شرکت متوقع ہے ــ!!

بقیہ تمام اجلاس 'قرآن اکیڈمی' ۳۶-کے، ماڈل ٹاؤن لاہور میں منعقد ہوں گے۔ روزانہ شام کو عصر تا مغرب مقالے کی نشست ہوگی جس میں اقتصادی، سماجی اور تحریکی مسائل پر روزانہ ایک ایک مقالہ پیش ہوگا جو تیس تا چالیس منٹ کا ہوگا۔ تقریباً نصف گھنٹہ سوالات کے جوابات کے لئے رکھا جائے گا، اور آخر میں صدارتی خطبہ ہوگا۔ ان کی تفصیل ان شاء اللہ العزیز کانفرنس کے انعقاد سے ایک ہفتہ قبل اخبارات میں شائع کر دی جائے گی ــ مغرب تا عشاء دو دن تقاریر کے سیشن ہوں گے اور ایک دن محفلِ قراءت کے لئے مخصوص رہے گا ــ اُمّید واثق ہے کہ ۲۱ر اپریل کو 'یومِ اقبال' کی تعطیل ہوگی، لہٰذا اُس روز ایک نشست ۹ بجے صبح تا ۱ بجے دوپہر بھی رکھی جائے گی اور اُس کا عنوان ہوگا: "علّامہ اقبال اور قرآنِ حکیم!"

سفرِ ہند کے دوران جن اصحابِ علم و فضل سے ملنا ہوا اُنہیں 'قرآن کانفرنس' میں شرکت کی دعوت بھی دی گئی۔ ان میں سے دو حضرات کے خطوط یہاں موصول ہوئے ایک ڈاکٹر اختر الواسع صاحب (جو صفحہ ۸ پر درج ہے) اور دوسرا مولانا تقی امینی مدظلہٗ کا، جن سے غائبانہ تعارف تو بہت عرصے سے تھا لیکن ملاقات کے بعد یگانگت کا احساس بہت ہی شدّت کے ساتھ پیدا ہوا۔ اُن کا ایک خط جو برادرم قاضی عبدالقادر صاحب کے خط کے جواب میں حال ہی میں موصول ہوا ہے۔ اس سے اندازہ ہوا کہ "دل را بہ دل رہیست!" کے مصداق یہی تاثّر اُن کا بھی ہے۔ اُن کا وہ گرامی نامہ حسبِ ذیل ہے:

دفتر ناظم سنّی دینیات   ۹ر مارچ ۱۹۸۰ء
مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

مخلصم و مکرّم جناب قاضی صاحب زید مجدکم   السّلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ!

گرامی نامہ پہنچ گیا تھا۔ اس کے بعد دو کتابیں بھی موصول ہوگئیں، بے حد خوشی ہوئی، دل سے دعائیں نکلیں۔ ڈاکٹر صاحب کے بعض مضامین بھی دیکھے۔ حیرت ہے کہ ہم دونوں کے درمیان اس قدر فکری ہم آہنگی ہے؟ اللہ تعالیٰ نے اس دور میں ڈاکٹر صاحب کو خدمتِ قرآن کی توفیق عطا فرمائی۔ یہ اُس کی بہت بڑی نعمت ہے۔ جس قدر بھی شکر کیا جائے کم ہے۔ اللہ سے دُعا ہے کہ ایسے مخلص بندوں کے صدقے میں مجھ ناچیز کو بھی قرآن فہمی کا سلیقہ عطا فرمائے، آمین! "مبادی" کا مطالعہ کر رہا ہوں۔ اپنے میں تو کچھ اہلیت نظر آتی نہیں ہے، آپ حضرات دُعا فرمائیں تو اُمید ہے کہ راستہ کھل جائے۔ ارادہ یہی ہے کہ اب بقیہ زندگی اسی میں گذرے۔ اس کے فضل و کرم اور توفیق کی دُعا کرتا رہتا ہوں۔

ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں سلام مسنون اور دُعا کی درخواست ضرور کریں اور آپ بھی فراموش نہ فرمائیں۔ پاسپورٹ بنوانے کی کوشش کر رہا ہوں، کامیابی اللہ ہی کے ہاتھ ہے۔ دیوبند جانے کی زیادہ قوی اُمید نہیں ہے۔ کہیں آنے جانے پر طبیعت آمادہ نہیں ہوتی، دُعا کی مکرّر درخواست ہے۔ خدا کرے آپ اور ڈاکٹر صاحب بخیریت ہوں ۔ والسلام

محمد تقی امینی

راقم نے انجمن کی تاسیس کے موقع پر ہی واضح کر دیا تھا کہ اس کے پیش نظر خدمتِ دین کا جو ہمہ گیر پروگرام ہے' انجمن اس کے صرف مرحلۂ اوّل کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس کے بعد ان شاء اللہ ایک 'باقاعدہ جماعت' کی تشکیل کا مرحلہ بھی جلد یا بدیر ضرور آئے گا۔ الحمد للہ کہ ۱۹۷۵ء میں وہ جماعت بھی 'تنظیم اسلامی' کے نام سے قائم ہو گئی تھی ___ اور اس کے بھی اب تک چار سالانہ اجتماع منعقد ہو چکے ہیں۔ اس بار اس کا سالانہ اجتماع بھی 'قرآن کانفرنس' کے متصل رکھ لیا گیا ہے ___ یعنی ۲۲ تا ۲۴ اپریل ۱۹۸۰ء، تاکہ بیرونِ لاہور کے رفقاء ایک ہی سفر میں دونوں میں شرکت کر سکیں! صرف 'قرآن کانفرنس' میں شمولیت کے لئے بیرونِ لاہور سے آنے والے حضرات کے قیام و طعام کا انتظام بھی 'قرآن اکیڈمی' ہی میں ہوگا ___ اگرچہ ہوگا درویشانہ انداز کا ___ اور ایسے حضرات کے لئے ۱۹ اور ۲۰ اپریل کے دن کے اوقات میں بھی اِن شاء اللہ مفید پروگرام رکھے جائیں گے ___ !!

مولٰینا سید ابوالاعلیٰ مودودی کی ذات وحیات سے متعلق اخبارات وجرائد کے خصوصی نمبروں کا سلسلہ تو اگرچہ اب ختم ہوگیا ہے، تاہم اُن کے بارے میں جذبات و تأثرات پر مشتمل مضامین اور انٹرویوز کی اشاعت کا سلسلہ تاحال جاری ہے۔

ع "کعبے سے اِن بُتوں کو بھی نسبت ہے دُور کی!" کے مصداق مولانا مودودی کی ذات سے ایک تعلق اِن سطور کے عاجز و ناکارہ راقم کو بھی رہا ہے۔ ایک خاصا لمبا عرصہ تو راقم کی زندگی کا وہ ہے جس کے دوران اُن کی شخصیت کو راقم کی بھی "محبت و عقیدت" کے 'مرکزِ اعلیٰ' کی حیثیت حاصل رہی۔ بعد میں وہ رشتے تو کمزور پڑتے پڑتے بالکل ٹوٹ گئے، البتہ "احسان مندی" کا ایک تعلق ہے جو جوں کا توں برقرار رہا، اور تاحال برقرار ہے۔!! اس کی تفصیل تو اِن شاء اللہ جلد ہی سپردِ قلم ہوگی۔ اس وقت صرف برسبیلِ تذکرہ عرض ہے کہ کچھ تو اسی 'نسبتِ قدیمہ' کا اثر تھا اور کچھ بدلے ہوئے حالات کا تقاضا کہ میں نے امریکہ کے سفر پر روانہ ہونے سے قبل یہ فیصلہ کیا تھا کہ اس کے دوران اگر ممکن ہوا تو مولانا سے ملاقات کروں گا۔ افسوس کہ مولانا سے ان کی زندگی میں تو ملاقات نہ ہوسکی، البتہ بفیلو میں انتقال کے بعد اُن کی صورت نہایت قریب سے دیکھنے اور نمازِ جنازہ ادا کرنے کا موقع مل گیا ـــــ فللّٰہ الحمد! اخبارات وجرائد کے جو خاص نمبر ان دنوں مولانا مرحوم کے نام سے مُعنوَن شائع ہو رہے ہیں، ان میں سے 'قومی ڈائجسٹ' کے نمائندے جناب فضل عظیم صاحب نے مجھ سے بھی ایک 'انٹرویو' کی خواہش ظاہر کی جو میں نے بخوشی دے دیا۔ اور جب انہوں نے اسے TADE سے صفحۂ قرطاس پر منتقل کرکے ایک نظر ڈالنے کے لئے مجھے دیا تو میں نے تو نہ پڑھا، البتہ ایک صاحب سے اس کی نقل کرالی تاکہ اسے 'میثاق' میں بھی شائع کردیا جائے ـــــ 'قومی ڈائجسٹ' کے اُس خاص شمارے میں تو یہ کسی سبب سے شائع نہ ہوسکا ـــ بلکہ اس کے بعد بھی ایک اشاعت میں وہ بار نہ پاسکا۔ البتہ اب مارچ کے شمارے میں وہ شائع ہوگیا ہے۔ لہٰذا ہم بھی اُسے ہدیۂ قارئین کررہے ہیں۔ جیسا کہ عرض کیا جاچکا ہے فضل عظیم صاحب نے جب اسے ٹیپ سے اُتار کردیا تھا تو راقم اسے نہیں پڑھ سکا تھا۔ اب کتابت شدہ صورت میں دیکھا تو اس میں چند ایک لفظی غلطیاں نظر آئیں جو غالباً سماعت کے مغالطے کا نتیجہ ہیں۔ مثلاً بھائی اظہار احمد صاحب کے ذکر میں بی۔ ایس۔ سی انجینئرنگ کے بجائے بی۔ اے یا اسی قبیل کی ایک دو اور غلطیاں جن کی اصلاح کردی گئی

ہے۔البتہ اب شائع شدہ انٹرویو سے تقابل سے معلوم ہوا کہ 'اصل' میں سے بعض چیزیں حذف کردی گئی ہیں۔جن میں سے ایک تو ایسی ہے جس کے بارے میں میں نے اختیار دیا تھا کہ چاہیں تو آپ حذف کردیں۔لیکن بعض دوسری باتیں ایسی بھی ہیں جن کے حذف کے باعث میرے نقطۂ نظر کی ترجمانی صحیح نہیں ہو پائی۔بہرحال اب اس مکمّل متن کی اشاعت سے اِن شاء اللہ اِس کا ازالہ ہو جائے گا۔۔!!

راقم نے اپنے "تحریکی سلسلۂ نسب" کو بحمداللہ کبھی چھپانے کی کوئی کوشش نہیں کی اور اسے اس اعتراف میں ہرگز کوئی باک نہیں ہے کہ اس کی قائم کردہ 'تنظیمِ اسلامی' مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم کی 'حِزبُ اللہ' اور مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودی مرحوم کی 'جماعتِ اسلامی' ہی کے سلسلہ کی ایک کڑی ہے، خواہ کتنی ہی چھوٹی اور حقیر کیوں نہ ہو۔یہی وجہ ہے کہ اس موضوع سے متعلّق کوئی بات کبھی سامنے آتی ہے تو فوراً توجّہ کا مرکز بن جاتی ہے۔۔۔ حال ہی میں معاصر 'جسارت' کراچی نے مولانا آزاد مرحوم کا ایک خط شائع کیا ہے جو ادارۂ جسارت کے تمہیدی نوٹ سمیت من وعن درج ذیل ہے:

مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودی جس زمانے میں "الجمعیّت" دہلی کے ایڈیٹر تھے اور اُن کے قلم کے جوہر کھل رہے تھے۔ اُس دور میں مولانا مودودی نے "الجمعیّت" کے "ابراہیم خلیلُ اللہ" نمبر کے لئے مولانا ابوالکلام کو خط تحریر کیا۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے اس ضمن میں ایک خط مفتیٔ اعظم ہند مولانا محمّد کفایت اللہ صاحب کو لکھا جس میں مولانا مودودی کے خط کا بھی تذکرہ ہے:

یہ خط مولانا مودودی نے "الجمعیّت" کے جون ۱۹۲۷ء کے شمارے میں شائع کیا۔ یہ خط اس کے بعد کہیں شائع نہیں ہوا، اور اب ۵۳ سال کے بعد پہلی مرتبہ شائع ہو رہا ہے۔ اس خط سے مولانا ابوالکلام آزاد اور سیّد ابوالاعلیٰ مودودی کے تعلّقات کے متعلّق واضح اشارہ ملتا ہے اور یہ ایک تحقیق طلب کام ہے:

اس خط میں کئی فکر انگیز خیالات ہیں اور بعض ایسے افکار بھی جن سے موجودہ اندھیروں میں افکار کے چراغ روشن کئے جاسکتے ہیں۔۔ خط میں تحریکِ نظمِ جماعت کی طرف اشارہ ہے اور قوم کی اجتماعیت کا بھی تذکرہ ہے:

مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم سے ہزار اختلافات کے باوجود اس خط کی تاریخی اہمیّت

مُسلّم ہے۔ مولانا ابوالکلام کی برسی ۲۲ فروری کو منائی گئی۔ اس کی مناسبت سے اس کی اشاعت ایک خاص اہمیّت رکھتی ہے۔ یہ خط سندھ ٹیکسٹ بک بورڈ کے چیئرمین جناب شاہ محمّد شاہ صاحب کی دریافت و عنایت ہے۔ "الجمعیّت" کا وہ شمارہ جس میں یہ خط شائع ہوا تھا، شاہ صاحب کے پاس موجود ہے۔ خط کا متن درج ذیل ہے!

صدیق محترم! "الجمعیّت" کے خاص نمبر کے لئے آپ نے ازراہِ عنایت تحریر طلب کی ہے۔ ایڈیٹر صاحب "الجمعیّت" اور مولانا احمد سعید صاحب کے خطوط اور تار پہنچے۔ مَیں ضرور اس کی تعمیل کرتا اگر ترتیبِ کُتب اور اجراءِ "الہلال" کی مشغولیّت مانع نہ ہوتی۔ علاوہ بریں آپ نے بحث و بیان کے لئے جو موا قبیح قرار دیئے ہیں اُن میں کوئی موضوع بھی ایسا نہیں ہے جس پر بارہا "الہلال" میں خامہ فرسائی نہ کی جا چکی ہو۔ اگر مقصود تجدیدِ فکر و ذوق ہے تو "الہلال" کے مقالات بجنسہٖ یا بہ تغیّرِ اسلوب و شکل شائع کئے جا سکتے ہیں۔ ان سے زیادہ بالفعل گنجائشِ بحث و بیان بھی نہیں۔ ولنعم ماقیل ؎

"ہماں عشق ست برخود بستہ چندیں داستاں ورنہ ❊ کسے بر معنیٔ یک حرف صد دفتر نمے سازد!"

البتہ وقت کے عملی مباحث میں سب سے زیادہ ضروری سوال وہی ہے جسے آپ نے آخری قرار دیا ہے۔ یعنی مسلمانانِ ہند کا موجودہ تشتّت و انتشار کیونکر نظم و اجتماع کی صورت اختیار کر سکتا ہے۔ لیکن حیران ہوں کہ اس کے جواب میں کیا عرض کروں؟ مَیں تو خود سرتاپا سوال ہوں شاید ہی گذشتہ دس پندرہ سال کے اندر کسی شخص نے قولاً و فعلاً اس سوال کے جواب دینے کی ایسی کوشش کی ہو جیسی مَیں کر چکا ہوں۔ لیکن افسوس ہے کہ وقت کا مزاج موافق نہیں ہوا، اور یہی فیصلہ کرنا پڑا کہ مستقبل کا انتظار کیا جائے ؎

از حُسن ایں چہ سوال ست کہ معشوق تو کیست؟ ❊ ایں سخن را چہ جواب ست تو ہم مے دانی!

مسلمانانِ ہند کے نظم و اجتماع کے لئے دو ہی طریقے ہو سکتے ہیں۔ حقیقی اور سادہ طریقہ تو وہی ہے جس پر خود اسلام کی رُوحِ شریعت مبنی ہے۔ یعنی منصبِ امامت کا قیام و نفاذ۔ آج کل کی بول چال میں یہ منصب ایک طرح کی ڈکٹیٹرشپ (تفویضِ مطلق) سے تعبیر کیا جائے گا۔ لیکن یہ ایسی ڈکٹیٹرشپ ہے جس کی طرف خود نصف یورپ کی موجودہ اجتماعی ذہنیت مائل ہو رہی ہے۔ اٹلی کا نیا جماعتی فوجی نظام دراصل اسلامی امامت ہی کی ایک زیادہ مطلق و مستند صورت ہے۔ تفصیل اس اجمال کی "الہلال" میں ملاحظہ کیجئے گا۔ علاوہ

بریں اسلامی امامت کو ڈکٹیٹر شپ سے تعبیر کرنا بھی اصلاً صحیح نہیں - اگرچہ تعبیر و تسمیہ کے معاملہ میں بہت وسعت ہے - اسلامی امامت کے نظامِ عمل میں عزم اور شوریٰ دونوں عنصر موجود ہیں، اور اس طرح وہ شخصیت کی قوت اور جماعت کی نگرانی، دونوں کو یک محل جمع کرتا ہے کہ "شاورھم فی الامر واذا عزمت فتوکل علی اللہ"۔ بہر حال حقیقی نظم تو یہ ہے، اگر وقت کا مزاج اس کا متحمل ہو سکے ؞

دوسرا طریقہ یہ ہے کہ جمعیتوں کے اصول پر کوئی ایسی جمعیت وجود میں آئے جو تمام منتشر اجزاءِ جماعت کو ایک نقطۂ اجتماع میں سمیٹ سکے - یہ آج کل کا عام اور معمولی طریقہ ہے، لیکن اس درجۂ نظم کی راہ میں بھی موانع کم نہیں ہیں جس طرح افراد کے اغراض لبسا اوقات مانعِ اجتماع ہوتے ہیں، اسی طرح جماعت بندی کی حالت میں جماعتوں کی ہستی بھی کسی بڑے اجتماع میں مدغم ہو جانا گوارا نہیں کرتی - بحالتِ موجودہ مسلمانوں میں افراد اور جماعات دونوں کی ہستیاں مانع کار ہیں - مذہب اور سیاست دونوں کے بے شمار حلقے بن گئے ہیں اور ہر حلقہ مقصد سے پہلے اپنی ہستی کی خیر منانا چاہتا ہے - ولعل اللہ یحدث بعد ذالک امرًا - والسلام علیکم ورحمۃ اللہ

کلکتہ ۲۵ رمئی ۱۹۲۷ء ابوالکلام

قارئینِ 'میثاق' فی الحال تو اس تاریخی خط کا ہدیہ من وعن قبول فرمانے پر اکتفا کریں - اس کے مندرجات اور اس پر ادارہ 'جسارت' کے تمہیدی نوٹ پر ان شاء اللہ پھر کبھی گفتگو ہو گی ؞

یک ماہی اشاعت کو دو ماہی بنانے کے لئے ایک اور مضمون جس کا فوری طور پر اضافہ کیا گیا وہ "قرآن اور آثارِ کائنات!" کی قسطِ ثانی ہے - راقم نے اس کی قسطِ اوّل بھی اشاعت کے بعد ہی دیکھی تھی - اسی وقت معلوم ہوا کہ یہ صرف "تفہیم القرآن" سے انتخاب پر ہی مشتمل ہے، تاہم یہ بھی محسوس ہوا کہ ہے مفید ـــــ بہرحال اس کے ضمن میں ایک دوسری وضاحت ضروری ہے اور وہ یہ کہ اس کی قسطِ اوّل پر مرتّب کا نام 'محمد یونس جنجوعہ' درج ہے، انہوں نے اس سے لاتعلقی کا اظہار کیا تو تحقیق کرنے پر معلوم ہوا کہ یہ ایک دوسرے 'محمد یونس' ہیں ـــــ جنجوعہ صاحب نہیں!

تقدیم

گذشتہ شمارے میں امریکہ کے سفر کی رُوداد کی جو پہلی قسط شائع ہوئی تھی اس میں حصار اور دہلی کا ذکر بھی موجود تھا۔ اس کی تحریر کے وقت سان گمان میں بھی یہ بات نہ تھی کہ فوراً ہی بچپن کی ان بھولی بسری یادوں کے بالفعل تازہ ہونے کی صورت بھی پیدا ہو جائے گی لیکن اللہ کا کرنا ایسا ہوا کہ: "چٹ منگنی پٹ بیاہ!" کے سے انداز میں سفرِ ہند کا اہتمام ہوا، اور فروری ۸۰ء کے پورے دو ہفتے راقم ہندوستان گذار آیا، اور چونکہ اس سفر میں برادرم قاضی عبدالقادر صاحب بھی ساتھ تھے (بلکہ صحیح یہ ہے کہ میں اُن کے ساتھ تھا!) لہٰذا اسی "چٹ منگنی پٹ بیاہ!" کے انداز میں واپس لاہور پہنچنے کے دوسرے ہی دن اُس کی رُوداد بھی تیار ہو گئی ـــ جسے میں بغیر پڑھے ہدیۂ ناظرین کر رہا ہوں۔ اس لئے کہ اُس صورت میں ممکن تھا کہ میں کچھ ردّ و بدل یا ترمیم و تنسیخ کرتا اور اس طرح اشاعت میں مزید تاخیر ہو جاتی۔ ـــ حصار میں راقم نے اپنی زندگی کے ابتدائی پورے پندرہ برس گذارے تھے۔ اُس کی گلیوں اور سڑکوں پر راقم لگ بھگ دو گھنٹے بالکل اجنبیوں کی طرح گھومتا رہا، اور اس دوران میں دوسرے بہت سے احساسات کے ساتھ سب سے گہرا نقش جو دل پر قائم ہوا وہ دُنیا کی بے ثباتی کا تھا۔ بقولِ غالب ؎

ہستی کے مت فریب میں آجائیو اسدؔ ؏ عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے!

یا بقول اقبالؔ ؏ "جو تھا نہیں ہے، جو ہے نہ ہوگا، یہی ہے اک حرفِ محرمانہ!" ـــ اور بقولہٖ تبارک و تعالیٰ: "كَأَنَّهُمْ يَوْمَ يَرَوْنَهَا لَمْ يَلْبَثُوا إِلَّا عَشِيَّةً أَوْ ضُحَاهَا" ـــ (النّٰزعٰت): "ایسے محسوس کریں گے جس دن کہ دیکھیں گے اس کو کہ نہیں رہے تھے مگر بس ایک رات یا اس کی صبح!"

مرکزی انجمن خُدّام القرآن لاہور کی ساتویں سالانہ قرآن کانفرنس کا ترمیم شدہ پروگرام کور کے صفحات پر دیکھا جا سکتا ہے۔ اس بار ہم یہ کانفرنس 'قرآن اکیڈمی' میں منعقد کر رہے ہیں۔ اس سے لاہور کے احباب کو تو یقیناً قدرے دقّت ہوگی، لیکن باہر سے آنے والے حضرات کو اُسی قدر سہولت رہے گی، اس لئے کہ اُن کے قیام کا انتظام بھی اکیڈمی ہی میں ہوگا۔ کانفرنس کے باضابطہ اجلاس تو کوئی تعطیل نہ ہونے کے باعث صرف شام ہی کو ہوں گے۔ لیکن باہر سے آنے والے حضرات کیلئے اِن شاء اللہ صبح کے اوقات میں بھی مفید پروگرام رکھے جائیں گے۔ اسی لئے 'تنظیمِ اسلامی' کا سالانہ اجتماع بھی ان ہی ایام میں رکھ لیا گیا ہے (۲۲ تا ۲۴ اپریل) تاکہ بیرونِ لاہور کے رفقاءِ تنظیم ایک ہی سفر میں دونوں میں شرکت کر سکیں ؏

اسرار احمد

قرآن حکیم کی دُعائیں

نشری تقریر

اسرار احمد

قرآن حکیم کی رُو سے انسان کی غایتِ تخلیق 'عبادتِ ربّ'، بفحوائے الفاظِ قرآنی: "وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ ۝ یعنی "میں نے جنوں اور انسانوں کو پیدا ہی اس لئے کیا ہے کہ وہ میری عبادت کریں!"۔ یہ 'عبادتِ ربّ' قرآن حکیم کی ایک نہایت جامع اور ہمہ گیر اصطلاح ہے جس کے جملہ پہلوؤں کا احاطہ اس وقت نہ ممکن ہے نہ مطلوب۔ البتہ اس کے اصل جوہر اور لُبِّ لُباب کی جانب رہنمائی فرمادی ہے صاحبِ جوامع الکلم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ان حد درجہ مختصر لیکن غایت درجہ جامع فرمودات مبارکہ میں کہ: "اَلدُّعَاءُ مُخُّ الْعِبَادَةِ - اور - "اَلدُّعَاءُ هُوَ الْعِبَادَةُ"!۔ یعنی دُعا ہی عبادت کا جوہر اور مغز ہے — بلکہ دعا ہی اصل عبادت ہے ۔

یہی وجہ ہے کہ قرآن حکیم میں بکثرت دعائیں وارد ہوئی ہیں۔ کہیں انشائیہ اسلوب میں۔ یعنی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کی وساطت سے جملہ اہل ایمان کو تلقین کے پیرائے میں کہ یوں کہو۔ یا یوں دعا مانگو جیسے: "وَقُلْ رَّبِّ زِدْنِيْ عِلْمًا" یعنی کہو کہ "اے میرے ربّ میرے علم میں اضافہ فرما!"۔ کہیں خبریہ انداز میں۔ یعنی سابقہ انبیاء و رُسُل اور صُلحاء و ابرار کی دعاؤں کے نقل کرنے کی صورت میں، یا عمومی طور پر اپنے محبوب اور نیکوکار بندوں کے دلی احساسات و جذبات کی ترجمانی کے انداز میں۔ مقدّم الذکر دعاؤں کی نہایت درخشاں مثالیں ہیں حضرت ابراہیم اور حضرت اسمٰعیل علیہما السّلام کی نہایت جامع دُعا کہ: "رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَا اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ!" یعنی "اے ربّ ہمارے ہم دونوں کو بھی اپنا تابع فرمان بنائے رکھ اور ہماری نسل میں سے بھی اپنی ایک فرمانبردار اُمّت برپا کیجیو!"۔ یا حضرت موسیٰ علیہ السّلام کی وہ دعا جو انتہائی کسمپرسی اور بے چارگی کے عالم میں اُن کے قلب کی گہرائیوں سے اُس وقت نکلی جب وہ مصر سے جان بچا

کر بھاگے اور سینکڑوں میل کا سفر طے کر کے مدین پہنچے جہاں کوئی یار و مددگار تو کیا ہوتا جاننے اور پہچاننے والا بھی نہ تھا۔ اس عالم میں انہوں نے دعا کی کہ: "رَبِّ اِنِّیْ لِمَآ اَنْزَلْتَ اِلَیَّ مِنْ خَیْرٍ فَقِیْرٌ" یعنی "اے ربّ میرے! میں سراپا محتاج ہوں ہر اُس خیر کا جو تو میری جھولی میں ڈال دے"۔ مؤخر الذکر دعاؤں کی نہایت درخشاں مثالیں سورۂ فرقان کے آخری رکوع میں ملتی ہیں جہاں اللہ تعالیٰ نے اپنے خاص بندوں یعنی 'عباد الرحمٰن' کے دلی احساسات و جذبات کی ترجمانی کرتے ہوئے فرمایا ہے: "وَالَّذِیْنَ یَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا اصْرِفْ عَنَّا عَذَابَ جَهَنَّمَ اِنَّ عَذَابَهَا كَانَ غَرَامًا" یعنی "وہ لوگ جو کہتے ہیں اے ہمارے ربّ! پھیر دے ہم سے جہنّم کے عذاب کو، یقیناً اُس کا عذاب لاگو ہو جانے والی چیز ہے"۔ اور: "وَالَّذِیْنَ یَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا هَبْ لَنَا مِنْ اَزْوَاجِنَا وَذُرِّیّٰتِنَا قُرَّةَ اَعْیُنٍ وَّاجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِیْنَ اِمَامًا"۔ یعنی اے ربّ ہمارے! ہمیں عطا فرما ہماری بیویوں اور اولاد سے آنکھوں کی ٹھنڈک اور بنا ہمیں خدا ترس لوگوں کا پیش رو"۔ مزید برآں خبریّہ اسلوب ہی میں قرآن مجید میں بیان ہوئی ہیں وہ دعائیں بھی جو عالمِ آخرت کے مختلف مراحل و مواقع یعنی میدانِ حشر، پل صراط اور جنّت و دوزخ میں مانگیں گے، اہلِ حق و ہدایت یا اہلِ زیغ و ضلال!

قرآنِ حکیم کی دعاؤں میں جامع ترین اور ہر اعتبار سے کامل و اکمل دعا ہے سورۂ فاتحہ جس میں مکمّل ترجمانی ہے فطرتِ انسانی کی۔ اور جس کے ضمن میں ادعیۂ قرآنیہ کا ایک دوسرا نادر اسلوب سامنے آتا ہے اور وہ یہ کہ اس کے آغاز میں نہ انشائیہ انداز ہے نہ خبریّہ یعنی نہ فعلِ امر 'قُلْ' - یا - 'قُوْلُوْا' وارد ہوا ہے نہ فعلِ ماضی یا مضارع 'قَالُوْا' یا 'یَقُوْلُوْنَ'۔ گویا اسلوبِ بیان یہ اختیار کیا گیا کہ یہ ہے وہ صدا یا دُعا جو ایک سلیم الفطرت اور سلیم العقل انسان کے قلب کی گہرائیوں سے از خود نکلتی ہے یا نکلنی چاہیئے۔ اسی اسلوب کی دوسری نہایت اعلیٰ مثالیں ہیں وہ دعائیں جو "الزھراوین" یعنی سُورۂ بقرہ اور سُورۂ آلِ عمران، دونوں کے آخر میں وارد ہوئی ہیں۔ چنانچہ سورۂ بقرہ کی آخری آیت کا آغاز تو ہوتا ہے نہایت شاہانہ انداز میں اِن قوانینِ الٰہیہ کے بیان سے کہ: "لَا یُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا"۔ یعنی: "اللہ نہیں مکلّف ٹھہراتا کسی کو مگر اُس کی وسعت کے مطابق"۔ اور: "لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَیْهَا مَا اكْتَسَبَتْ"۔ یعنی

"اُس کو ملے گا جو اُس نے کمایا ہوگا اور اُسی پر پڑے گی جو بُرائی اُس نے کی ہوگی !"
اور اس کے بعد بغیر کسی انشائیہ یا خبریّہ تمہید کے دُعا شروع ہوجاتی ہے :
"رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَآ اِنْ نَّسِيْنَآ اَوْ اَخْطَاْنَا ۚ رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْ عَلَيْنَآ اِصْرًا كَمَا حَمَلْتَهٗ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِنَا ۚ رَبَّنَا وَلَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهٖ ۚ وَاعْفُ عَنَّا وقفہ وَاغْفِرْ لَنَا وقفہ وَارْحَمْنَا وقفہ اَنْتَ مَوْلٰىنَا فَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ۝"

"یعنی اے ربّ ہمارے ! نہ گرفت فرما ہماری اگر ہم بھول جائیں یا غلطی کر بیٹھیں۔ اے ربّ ہمارے! مت عائد فرما ہم پر ایسی ذمّہ داریاں جیسی کہ تو نے عائد کیں ہم سے پہلے والوں پر، اور نہ ڈال ہم پر وہ جس کی ہم طاقت نہ رکھتے ہوں، اور درگذر فرما ہم سے، اور بخشش فرما ہماری، اور رحم فرما ہم پر، اور مدد فرما ہماری کافروں کے مقابلے میں !"
بالکل یہی اُسلوب سورۂ آلِ عمران کے آخری رکوع میں ہے کہ "اَلَّذِيْنَ يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِيٰمًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰى جُنُوْبِهِمْ !" کے فوراً بعد بغیر کسی فعل "قَالُوْا" یا "يَقُوْلُوْنَ" کے آغاز ہوجاتا ہے اِس عظیم دُعا کا جو "رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا ۚ" سے شروع ہوتی ہے — اور — اِنَّكَ لَا تُخْلِفُ الْمِيْعَادَ ط — پر ختم ہوتی ہے۔

سورۂ بقرہ کی آیت نمبر ۲۵۰ میں بنی اسرائیل کی تاریخ کے ایک اہم واقعہ کے ضمن میں حضرت طالوت کے اہلِ ایمان ساتھیوں کی وہ دُعا نقل ہوئی ہے جو انہوں نے اُس وقت مانگی تھی جب اُن کا سامنا جالوت اور اُس کے لشکر سے ہوا — ارشاد ہوتا ہے: "وَلَمَّا بَرَزُوْا لِجَالُوْتَ وَجُنُوْدِهٖ قَالُوْا رَبَّنَآ اَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا وَّثَبِّتْ اَقْدَامَنَا وَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ۝" یعنی "جب وہ سامنے ہوئے جالوت اور اُس کی فوجوں کے تو انہوں نے کہا۔ اے رب ہمارے ! انڈیل دے ہم پر صبر اور جما دے ہمارے قدم اور مدد فرما ہماری کافروں کے مقابلے میں !" — بادنیٰ تأمّل واضح ہو جاتا ہے کہ اس دُعا میں ایک عکسِ کامل موجود ہے۔ یا بالفاظِ دیگر یہ مکمّل خلاصہ ہے اُس مفصّل اور عظیم دُعا کا جس کا ذکر پہلے ہوچکا ہے اور جس پر سورۂ بقرہ ختم ہوتی ہے۔ اور ذرا غور کرنے سے معلوم ہوجاتا ہے کہ اس مناسبت و مشابہت کا سبب کیا ہے۔ تاریخ

بنی اسرائیل میں معرکۂ طالوت و جالوت کو وہی مقام اور اہمیّت حاصل ہے جو اُمّتِ محمّد علیٰ صاحبہا الصّلوٰۃ والسّلام کی تاریخ میں غزوۂ بدر کو حاصل ہے ــــ کہ جس طرح بنی اسرائیل کے دورِ عروج یا عہدِ زرّیں یعنی ملکِ داؤد و سلیمان علیہما السّلام کا آغاز ہوا معرکۂ طالوت و جالوت سے، اسی طرح اسلام کا وہ دورِ غلبہ و عروج شروع ہوا غزوۂ بدر سے جس کا نقطۂ کمال یعنی CLIMAX ہے خلافتِ حضراتِ صدّیقِ اکبر و فاروقِ اعظم و عثمانِ غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہم ــــ اب اگر یہ بات پیشِ نظر رہے کہ سورۂ بقرہ کا زمانۂ نزول ہے ہجرت کے متّصلاً بعد سے لے کر غزوۂ بدر سے متّصلاً قبل تک تو بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم کے ساتھیوں کو ماضی کی تاریخ کے اس ورق کے ذریعے دراصل دکھایا جارہا ہے آنے والے حالات و واقعات کا ایک واضح عکس ۔ کہ جس طرح سامنا کرنا پڑا تھا حضرت طالوت کے مُٹھّی بھر بے سروسامان اہلِ ایمان ساتھیوں کو جالوت کے غرقِ آہن لشکروں کا، اسی طرح تمہارا مقابلہ ہونے والا ہے کل تین سو تیرہ کی تعداد اور نہایت بے سروسامانی کی حالت میں قریش کے ایک ہزار کیل کانٹے سے لیس غرقِ آہن سورماؤں سے ــ اور جس طرح صبر و ثبات کے صلے میں اللہ تعالیٰ نے انہیں فتح دی تھی ان کے دشمنوں پر اُسی طرح اگر تم بھی صبر کا دامن تھامے رکھو اور اللہ تعالیٰ کی نصرت و تائید پر بھروسہ رکھو تو وہ (اللہ) تمہیں بھی فتح عطا فرمائے گا تمہارے دشمنوں پر۔ یہی وجہ ہے کہ سورۂ بقرہ کی آیت ۲۵۰ میں نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم اور آپؐ کے ساتھیوں کو وہ دعا بھی سُنا دی گئی جو حضرتِ طالوت کے ساتھیوں نے مانگی تھی اور پھر آیت ۲۸۶ میں وہ مفصّل دعا بھی تلقین فرمادی گئی جو اب نکلنی چاہیئے اہلِ ایمان کے قلوب کی گہرائیوں سے ــ اور اسی پر ختم فرمادیا اس سورۂ مبارکہ کو ــــــ!!

واضح رہے کہ دُعا کی اصل روح ہے اللہ کے سمیع و بصیر اور عَلیٰ کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ہونے کا یقینِ کامل ــ اور اُسی کی نصرت و تائید اور توفیق و تیسیر پر کامل توکّل و اعتماد ــ اور یہی دونوں چیزیں ہیں جو ہمیں ان دونوں دعاؤں کے ایک ایک حرف میں رچی بسی نظر آتی ہیں ٭

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۝

سلسلۂ نور بخشیہ

کے ضمن میں ایک غلط فہمی کا ازالہ

غلام حسن نور بخشی ـــــ و ـــــ محمد حق نواز بلتستانی

محترم پروفیسر یوسف سلیم چشتی مدظلہٗ کا مقالہ: اسلامی تصوف میں غیر اسلامی نظریات کی آمیزش!" اوّلاً ماہنامہ 'میثاق' میں ۶۸-۱۹۶۹ء کے دوران چھ اقساط میں شائع ہوا تھا اور پھر یکجا صورت میں ستمبر، اکتوبر ۱۹۷۶ء کی مشترک خصوصی اشاعت کے طور پر شائع ہوا (اور اب کتابی صورت میں طبع شدہ موجود ہے!) اس میں کشمیر کے سلسلۂ نور بخشیہ سے متعلق جو چند اشارات آئے ان کے ضمن میں تردیدی وضاحت پر مشتمل ایک خط غلام حسین نور بخشی صاحب کا ہمیں ملا تھا، لیکن اس مراسلہ نگار نے اپنا پتہ درج نہیں کیا تھا لہٰذا اسے قابلِ اشاعت نہ سمجھا گیا۔ گذشتہ سال بلتستان سے تعلق رکھنے والے ایک نہایت نیک اور دردمند نوجوان محمد حق نواز صاحب تنظیم اسلامی میں شامل ہوئے تو اُن سے نور بخشی سلسلے کے بارے میں کچھ معلومات حاصل ہوئیں جن سے غلام حسین صاحب کے خط کے مندرجات کی تائید ہوئی۔ چنانچہ اب وہ خط محمد حق نواز صاحب کی نظرِ ثانی اور کسی قدر حک و اضافہ کے ساتھ شائع کیا جا رہا ہے ـــــ اسرار احمد

ماہنامہ 'میثاق' بابت ماہ ستمبر و اکتوبر ۱۹۷۶ء میں تصوّف کے بارے میں خصوصی اشاعت پڑھ کر بہت دکھ ہوا کیونکہ محترم المقام پروفیسر یوسف سلیم چشتی صاحب کے مقالے کے مطالعہ کرنے سے پہلے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ پروفیسر موصوف نے اپنے مقالے کے سلسلے میں نہ کوئی نور بخشی لٹریچر دیکھا ہے اور نہ ہی حضرت سیّد محمد نور بخش کی کتابوں ہی سے استفادہ فرمایا ہے۔ نیز پروفیسر موصوف کے مقالے پر حضرت مولانا امین احسن اصلاحی صاحب

نے جو تائیدی تقریظ لکھی ہے، اُس سے اندازہ ہوتا ہے کہ علمائے کرام بھی سلسلۂ نوربخشیہ کو تاریخی حوالے سے ایک گمراہ اور مائل بہ تشیّع فرقہ سمجھتے ہیں۔ لہٰذا ضروری سمجھا کہ محترم پروفیسر صاحب کے مقالے سے قارئین کے ذہن میں مذہبِ نوربخشیہ کا جو غلط تصوّر ابھرا ہے، اُسے دُور کرنے کے لئے چند ضروری نگارشات پیش کروں۔

'میثاق' کے صفحہ ۳۰ پر "کشمیر زیرِ نگین سلاطین" نامی کتاب کے حوالے سے لکھتے ہیں: "اس کی تعلیمات میں شیعہ عقائد کا رنگ نمایاں ہے!" حالانکہ یہ بات بالکل غلط اور بے بنیاد ہے کہ سیّد محمّد نوربخش رح کی تعلیمات میں شیعیّت ہے یا خود حضرت سیّد محمّد نوربخش مائل بہ تشیّع تھے۔ آپ کی تعلیمات افراط و تفریط سے بالکل پاک ہیں۔ سیّد محمّد نوربخش رح کی تعلیمات نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم کی سُنّت اور فرمانِ نبوی کا نچوڑ ہیں۔ البتّہ یہ رسومات جو اس وقت سلسلۂ نوربخشیہ میں رائج ہیں، اُن کا حضرت سیّد محمّد نوربخش رح کی تعلیمات سے کوئی تعلّق نہیں ہے۔ یہ سب شیعی عقائد ہیں اور شیعوں نے مکر و فریب کے ساتھ ان کو مذہبِ نوربخشیہ میں داخل کیا ہے۔ بلکہ حقیقت میں سلسلۂ نوربخشیہ اور نوربخشی تعلیمات افراط و تفریط سے مُبرّا ایک ایسا معتدل اور جامع مذہب ہے اور باقی افراط و تفریط کے شکار فرقوں کے مقابلہ میں عقائد و مسائل، اُصول و فروع کا ایک متفقہ پلیٹ فارم" ہے جس کے اندر ملّتِ اسلامیہ کا اتّحاد و اتفاق اور ملّی وحدت موجود ہے نیز 'میثاق' کے اسی صفحہ پر لکھا ہے کہ: "یہ لوگ خلفائے ثلاثہ کی شان میں گستاخی کرتے ہیں!" نعوذ باللہ! یہ بات بالکل غلط ہے اور یہ نوربخشیوں پر صریح بہتان ہے۔ نوربخش لوگ خلفائے راشدین یا اُمّہات المؤمنین کے بارے میں گستاخی یا بے ادبی بالکل نہیں کرتے ہیں۔ بلکہ ایسا کرنے والوں کو اللہ تبارک و تعالیٰ کے غضب کا مستحق سمجھتے ہیں۔ نوربخشیوں کی کسی کتاب میں اور نہ ہی عقائد میں صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی شان میں کوئی گستاخانہ بات پائی جاتی ہے اور نہ کوئی ثابت کر سکتا ہے۔ نوربخشی تمام صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کو مومن اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلّم کے جان نثار ساتھی سمجھتے ہیں، اور یہی عقائد ہماری کتابوں میں بھی ہیں۔ بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ نوربخشی عقائد کی تمام کتابوں میں صحابہ کرام رض اور خلفائے راشدین و اُمّہات المومنین کی شان میں ہدیۂ عقیدت اور نذرانے پیش کئے ہیں اور کوئی بھی قاری اس سلسلے میں مزید اطمینان چاہتا ہو تو نوربخشیہ مذہب کی مستند کتابوں (نجم الہُدیٰ، کشف الحقیقت

نور المؤمنین - اور قائم الحق) کا مطالعہ کر سکتا ہے ؛
مزید 'میثاق' کے اسی صفحہ پر لکھا ہے کہ "نوربخش نے امام مہدی المنتظر ہونے کا دعویٰ کیا تھا!" یہ بھی بالکل غلط اور بے بنیاد بات ہے۔ حضرت محمد نوربخش رح نے کبھی بھی مہدئ موعود ہونے کا دعویٰ نہیں کیا اور نوربخشی انہیں امام نہیں مانتے بلکہ صرف پیر اور مجتہد مانتے ہیں اور اگر امام مانتے بھی ہیں تو انہی معنوں میں جن میں حنفی حضرات امام ابوحنیفہ کو مانتے ہیں، اِس سے ہٹ کر کچھ بھی نہیں مانتے۔ مہدویت کا الزام حضرت سید محمد نوربخش رح پر اس وقت کے "علمائے سوء" نے اُن کے علمی اور عملی کارناموں سے حسد کی بنا پر باقاعدہ سازش کے تحت انہیں بدنام کرنے کے لئے لگایا تھا جو کہ بالکل باطل ہے۔ جیسا کہ مشہور نقاد، مؤرخ اور محقق دانشور اُستاد سعید نفیسی صاحب کی لکھائی ہے وہ لکھتے ہیں کہ "با دعائے مہدویت متہمش ساختند در این باشاہ از حبس وتبعید داد!"
(احوال و آثارِ علاؤ الدولہ سمنانی صہ) ؛
نیز سید محمد نوربخش نے سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے اسم مبارک اور کنیت کو ایک ساتھ لکھنے سے منع کیا ہے اور کہا ہے "یکرہ ان یجمع اسم محمدؐ مع کنیۃ ابی القاسم اولمن قال فیہ رسول اللہؐ اسمہ اسمی وکنیتہ کنیتی"
(ملاحظہ ہو فقہ احوط صہ۲۷) ؛
یہ حوالجات کافی ہیں اس بات کے ثبوت کے لئے کہ حضرت سید محمد نوربخش رح نے کبھی بھی مہدویت کا دعویٰ نہیں کیا، اور یہ کہ نوربخشیہ والے بھی ان کو امام ان معنوں میں نہیں سمجھتے ہیں جن معنوں میں شیعہ اپنے بارہ ۱۲ اماموں کو سمجھتے اور مانتے ہیں۔ یعنی یہ کہ شیعہ عقائد کی رُو سے امام "منصوص من اللہ" اور "معصوم" ہیں اور چونکہ یہ خیال اور عقیدہ باطل ہے لہٰذا نوربخشی کسی کو ان معنوں میں امام نہیں مانتے جن معنوں میں شیعہ اپنے اماموں کو سمجھتے ہیں۔ نوربخشی حضرت سید محمد نوربخش رح کو صرف پیرِ طریقت اور مجتہد سے زیادہ اور کچھ نہیں سمجھتے اور مانتے ہیں ؛
پروفیسر صاحب اپنی کتاب "اسلامی تصوف میں غیر اسلامی نظریات کی آمیزش!" کے صہ۱۳۱ پر لکھتے ہیں: "نوربخشی سلسلے کے عقائد 'احوط' نامی کتاب میں مندرج ہیں!"
یہ بات بھی صحیح نہیں ہے کہ 'احوط' نامی کتاب نوربخشیوں کی عقائد کی کتاب ہے بلکہ وہ تو

باقی صہ۲۲ پر دیکھیں!

یقین: رُوحِ سعی و عمل

از

ڈاکٹر اسرار احمد

یہ مقالہ ریڈیو پاکستان لاہور کے ماہ ربیع الاوّل کے پروگرام

خیرُالوریٰ

میں بتاریخ ۱۴ جنوری ۸۰ء نشر ہوا

اَحْمَدُہٗ وَ اُصَلِّیْ عَلٰی رَسُوْلِہِ الْکَرِیْمِ۔ اَمّا بعد۔ فَاَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ○ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ○

محترم صدرِ مجلس و مہمانِ خصوصی اور معزز سامعین!

یہ بات کہ یقین ہی انسان کی سعی و عمل کی اصل رُوح ہے اتنی ظاہر و باہر ہے کہ بظاہر اس کے بارے میں کچھ عرض کرنا تحصیلِ حاصل نظر آتا ہے ــــ اس لئے کہ کون نہیں جانتا کہ انسانی شخصیت کے دو [2] پہلو ہیں: ایک [1] علمی یا فکری و نظری پہلو اور دوسرا [2] عملی پہلو۔ اور

دونوں کے مابین ایک نہایت گہرا اور مضبوط تعلّق پایا جاتا ہے۔ یعنی ایک سبب ہے اور دوسرا اُس کا نتیجہ اور اُن کے مابین لازم و ملزوم کی بہ نسبت اتنی قوی ہے کہ دونوں کو ایک ہی تصویر کے دو رُخ قرار دینا قطعًا غلط نہ ہوگا۔ یعنی ایک انسانی شخصیت کا باطنی و داخلی رُخ ہے اور دوسرا اس کا ظاہری و خارجی رُخ ـــــ چنانچہ عام مشاہدہ ہے کہ جو باتیں انسان کے فکر و نظر میں رچتی بستی چلی جاتی ہیں، گویا جن اُمور پر یقین اس کے دل و دماغ میں راسخ ہوتا چلا جاتا ہے، اُن کے اثرات اس کے فعل و عمل، سعی و جُہد اور طلب و جستجو میں نمایاں ہوتے چلے جاتے ہیں۔ اور پھر جتنا جتنا اضافہ اس یقین کی گہرائی و گیرائی میں ہوتا چلا جاتا ہے، اتنی ہی شدّت سعی و عمل میں بڑھتی چلی جاتی ہے ـــــ یہاں تک کہ کسی انسان کی سعی و عمل کے انداز اور طلب و جستجو کے رُخ سے اُس کے عقائد و نظریات بھی پوری صحّت کے ساتھ مستنبط کئے جا سکتے ہیں اور اُن کے سطحی یا راسخ ہونے کا بھی ٹھیک ٹھیک اندازہ کیا جا سکتا ہے ؂

البتّہ ایک وضاحت ضروری ہے اور وہ یہ کہ یہ معاملہ انسان کے حقیقی اور واقعی افکار و نظریات یا بالفاظِ دیگر اس کی اصل ذہنی اقدار کا ہے، اُس کے مُبیّنہ عقائد یا مزعومہ خیالات و نظریات کا نہیں۔ اس لئے کہ قول و فعل کا وہ تضاد جو بہت سے انسانوں میں نظر آتا ہے، دراصل اس کے حقیقی و واقعی نظریات اور اس کے مبیّنہ عقائد کے فرق و تفاوت کا مظہر ہوتا ہے، قطع نظر اس سے کہ خود اُسے اس کا ادراک و شعور ہو یا نہ ہو ـــــ اسی طرح کا ایک معاملہ ان مریض شخصیتوں کا بھی ہے جنھیں ضعفِ ارادہ کی بیماری لاحق ہوتی ہے۔ جس کے باعث ان کے حقیقی عقائد و نظریات بھی ان کے عمل پر پوری طرح اثر انداز نہیں ہو سکتے لیکن ظاہر ہے کہ یہ ایک استثنائی معاملہ ہے ورنہ عام اصول بہر حال یہی ہے کہ ایک نارمل انسان کی سعی و عمل کا رُخ بھی اس کے یقین ہی سے متعیّن ہوتا ہے اور اس کی شدّت و قوّت یا ضعف و اضمحلال کا دارومدار بھی یقین کی پختگی یا کمزوری ہی پر ہوتا ہے ؂

اس میں ہرگز کوئی شک یا شبہ نہیں ہے کہ حضرتِ خیرالورٰی صلّی اللہ علیہ وسلّم و فداہ آباءنا و اُمّہاتنا جن کے نامِ نامی اور اسمِ گرامی سے یہ سلسلۂ تقاریر معنون ہے، کی تعلیم و تلقین اور تزکیہ و تربیت سے جو پیکرِ یقین اور مجسمۂ سعی و عمل جماعت رضوان اللہ تعالٰی علیہم اجمعین تیار ہوئی تھی اس کی کوئی دوسری نظیر پوری انسانی تاریخ پیش کرنے سے

عاجز ہے۔ البتہ جب آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حوالے سے بات کی جائے تو یقین کے ضمن میں ایک وسیع تر اصطلاح سامنے آتی ہے ــــ یعنی 'ایمان' اور سعی و عمل کے لئے ایک زیادہ حسین و جامع عنوان سامنے آتا ہے ــــ یعنی 'جہاد' اور ان دونوں کے مابین چولی دامن کے رشتے اور لازم و ملزوم کی نسبت کو واضح کیا گیا ہے۔ قرآن حکیم میں متعدد مقامات پر مختلف الفاظ و اسالیب میں۔ ان میں سے اہم ترین اور جامع ترین مقام تو ہے سورۂ حجرات کی آیت ۱۵ جہاں ارشاد ہوتا ہے :

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا (یعنی) مومن تو بس وہی ہیں جو ایمان لائے اللہ پر	
بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوْا وَ اور اس کے رسولؐ پر پھر شک میں نہیں پڑے	
جٰهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ اور جہاد کیا انہوں نے اپنے اموال اور اپنی	
فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ جانوں سے اللہ کی راہ میں (حقیقت میں)	
الصّٰدِقُوْنَ ۝ صرف یہی لوگ سچے ہیں!	

یہی بات سورۂ صف میں ان الفاظ میں سامنے آتی ہے :

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا هَلْ اَدُلُّكُمْ : یعنی اے اہلِ ایمان! کیا میں تمہاری رہنمائی کروں
عَلٰى تِجَارَةٍ تُنْجِيْكُمْ مِّنْ عَذَابٍ اس کاروبار کی جانب جو تمہیں دردناک عذاب
اَلِيْمٍ ۝ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ سے چھٹکارا دلا دے؟ ایمان محکم رکھو اللہ پر اور
وَتُجَاهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِكُمْ اس کے رسولؐ پر۔ اور جہاد کرو اللہ کی راہ میں اپنے
وَاَنْفُسِكُمْ ؕ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ اموال اور اپنی جانوں سے، اگر تم صاحبِ علم ہو
تَعْلَمُوْنَ ۝ تو یہی تمہارے حق میں بہتر ہے!

اور "اِک پھول کا مضمون ہو تو سو رنگ سے باندھوں!" کے مصداق یہی حقیقت واضح کی گئی ہے سورۂ انفال کی آیت ۷۴ میں بدیں الفاظ :

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَهَاجَرُوْا وَجٰهَدُوْا (یعنی) اور وہ لوگ جو ایمان لائے اور انہوں نے	
فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ اٰوَوْا وَّنَصَرُوْٓا ہجرت کی اور جہاد کیا اللہ کی راہ میں ــــ اور وہ	
اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا ؕ جنھوں نے پناہ دی اور نصرت کی۔ یہی لوگ	
لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّرِزْقٌ كَرِيْمٌ ۝ ہیں حقیقتاً مومن، ان کے لئے مغفرت بھی ہے	
اور باعزّت رزق بھی!	

ذہن و قلب کی وہ خاص کیفیت جو قرآن حکیم کی آیاتِ بیّنات اور نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم کی تعلیم و تربیت کے ذریعے صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے نفوس میں پیدا ہو گئی تھی ــــ یا صحیح تر الفاظ میں جو قرآنِ حکیم کی آیاتِ بیّنات کے ذریعے نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم نے پیدا فرما دی تھی، بفحوائے الفاظِ قرآنی: "هُوَ الَّذِي يُنَزِّلُ عَلَىٰ عَبْدِهِ آيَاتٍ بَيِّنَاتٍ لِيُخْرِجَكُمْ مِنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّورِ" (الحدید آیت ۹) اس کی تعبیر کے لئے قرآنِ حکیم اگرچہ کہیں کہیں لفظِ 'یقین' بھی استعمال کرتا ہے بالخصوص آخرت کے ضمن میں۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ اس کے لئے قرآن کی اصل اصطلاح 'ایمان' ہی کی ہے جو 'یقین' کی نسبت وسیع تر بھی ہے اور زیادہ بامعنیٰ بھی۔

'یقین' کے لفظی معنی کے ضمن میں امام راغب اصفہانی اپنی شہرۂ آفاق تصنیف "مُفرداتُ القرآن" میں لکھتے ہیں:

اليقينُ صِفَةُ العلم فوق المعرفَةِ والدّرايةِ واخواتها۔ يقال علم اليقين ولا يقال معرفة اليقين وهو سكونُ الفهمِ مَعَ ثَبَاتِ الحُكْمِ

(یعنی، یقین اگرچہ علم ہی کی کیفیت کا نام ہے تاہم وہ مجرّد عقلی پہچان یا منطقی استدلال اور اس قبیل کی دوسری چیزوں سے بلند تر ہے۔ چنانچہ 'علم الیقین' تو کہا جاتا ہے لیکن معرفۃ الیقین نہیں بولا جاتا۔ گویا یقین وہ کیفیت ہے جس میں فہم و شعور کا ٹھہراؤ اور رائے کی پختگی دونوں شامل ہیں ــــ!!

اس سے ایک طرف تو یہ واضح ہو گیا کہ 'یقین' ایک خالص داخلی کیفیت کا نام ہے اور دوسری طرف یہ اشارہ بھی مل گیا کہ اس میں کسی بات کے صحیح یا مطابقِ واقعہ ہونے یا نہ ہونے سے کوئی بحث نہیں ہے۔ گویا 'یقین' صحیح بھی ہو سکتا ہے اور غلط بھی ــــ ایمان کا معاملہ ان دونوں اعتبارات سے بالکل برعکس ہے۔ چنانچہ ایک طرف جانب تو اس میں "تصدیق بالقلب" کے ساتھ ساتھ "اِقرار باللّسان" بھی لازمی ہے اور دوسری جانب ایمان نام ہے نفس الامر کی ان ازلی و ابدی حقیقتوں پر یقین کا، جن کی شہادت خود فطرتِ انسانی میں مضمر ہے، لہٰذا اس کا اصل حاصل ہے ذہنی سکون اور قلبی اطمینان یا بالفاظِ دیگر شخصیّتِ انسانی کا داخلی امن۔ یہی وجہ ہے کہ قرانِ حکیم کی یہ اساسی و بنیادی اصطلاح ماخوذ ہی 'امن' کے مادّے سے ہے۔ ✤

'ایمان'۔ 'امن' سے بابِ افعال کا مصدر ہے جس کے خواص میں 'تعدیہ' بھی شامل ہے۔ یعنی جو افعال ثلاثی مجرّد میں 'لازم' ہوتے ہیں وہ اس باب میں آکر بالعموم 'متعدّی' ہوجاتے ہیں۔ چنانچہ اس کے لفظی معنی ہوئے 'امن دینا' ـــــ اور جب اس پر اضافہ ہو حروفِ جار 'با' یا 'لام' کا تو اس کے معنی ہوجاتے ہیں کسی کی تصدیق کرنا۔ 'لام' کے ساتھ ہو تو عموماً سطحی اور سرسری سی تصدیق مراد ہوتی ہے اور 'با' کے ساتھ ہو تو پورے وثوق اور اعتماد والی تصدیق ـــــ واضح رہے کہ اصل مادّے یعنی 'امن' سے اس کا تعلّق اب بھی منقطع نہیں ہوسکتا۔ اس لئے کہ کسی شخص کی لائی ہوئی کسی خبر یا اس کے کسی دعوے کی تردید و تکذیب کا لازمی نتیجہ ردّو قدح اور فتنہ وفساد ہے اور اس کی توثیق و تصدیق کا منطقی نتیجہ امن وسکون۔ چنانچہ اصطلاحِ شرع میں ایمان نام ہے: تصديق بما جاء به النبي صلى الله عليه وسلم کا یعنی ان امورِ غیبی کی تصدیق کا جن کی خبر دی ہے محمدّ رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم نے ـــــ اور بالکل فطری اور منطقی طور پر اس کے دو رُخ یا دو پہلو ہیں: ایک خارجی وظاہری یعنی "اقرار باللسان" والا پہلو جس پر اس دُنیا میں کسی انسان کے مومن ومسلم قرار دیئے جانے کا دار و مدار ہے۔ چنانچہ وہ کلمۂ شہادت کی صورت میں ارکانِ اسلام میں اوّلین رکن کی حیثیت سے شامل ہے اور دوسرا داخلی وباطنی پہلو جو عبارت ہے 'یقینِ قلبی' سے اور جو رکنِ رکین ہے ایمانِ حقیقی کا اور جس کا لازمی نتیجہ ہے جہاد یا مجاہدہ فی سبیل اللہ ـــــ!!

الغرض ایمانِ حقیقی ہی کا دوسرا نام یقین ہے اور اس کا محلّ 'قلب' ہے۔ چنانچہ قرآن حکیم میں متعدّد مقامات پر ایمانِ حقیقی کا محلّ 'قلب' کو قرار دیا گیا جیسے:

(۱) سورۂ حجرات کی آیت ۷ میں صحابۂ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

وَلٰكِنَّ اللّٰهَ حَبَّبَ اِلَيْكُمُ الْاِيْمَانَ وَزَيَّنَهٗ فِىْ قُلُوْبِكُمْ (یعنی) اللہ نے محبوب بنا دیا ہے تمھارے نزدیک ایمان کو اور کھبا دیا ہے اسے تمھارے دلوں میں ـــــ!!

(۲) اور آیت ۱۴ میں بعض بدّوؤں سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

وَلَمَّا يَدْخُلِ الْاِيْمَانُ فِىْ قُلُوْبِكُمْ (یعنی) ابھی تک ایمان تمھارے دلوں میں داخل نہیں ہوا۔

(۳) اسی طرح سورۂ مجادلہ کی آیت ۲۲ میں سچے اور مخلص اہلِ ایمان کے بارے میں فرمایا :

اُولٰٓئِكَ كَتَبَ فِىْ قُلُوْبِهِمُ الْاِيْمَانَ وَاَيَّدَهُمْ بِرُوْحٍ مِّنْهُ ۗ وَيُدْخِلُهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِىْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۗ رَضِىَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ ۗ اُولٰٓئِكَ حِزْبُ اللّٰهِ ۗ اَلَآ اِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝

(یعنی) یہی لوگ ہیں جن کے دلوں میں راسخ کر دیا ہے ایمان اور تائید کی ہے ان کی اپنے خاص فیض سے، اور داخل کریگا اُن کو اُن باغات میں جن کے دامن میں ندّیاں بہتی ہوں گی جہاں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ اللہ اُن سے راضی اور وہ اُس سے خوش۔ یہ جماعت ہے اللہ کی۔ سُن رکھو اللہ کی جماعت ہی فلاح پانے والی ہے ——!!

اس یقین قلبی کے تین مدارج قرآنِ حکیم نے متعیّن فرمائے ہیں۔ علم الیقین، عین الیقین اور حق الیقین۔ ان میں سے مقدّم الذکر دونوں کا تذکرہ سورۂ تکاثر میں ہے اور مؤخر الذکر الفاظ دو جگہ آئے ہیں ایک سورۂ واقعہ میں اور دوسرے سورۂ حاقّہ میں —— ان تینوں کے مابین فرق وتفاوت کو آگ کی سادہ سی مثال سے سمجھا جا سکتا ہے۔ اگر کہیں دور سے دُھواں نظر آئے تو یقین پیدا ہو جاتا ہے کہ وہاں آگ ہے۔ یہ علم الیقین کا پہلا درجہ ہے جس میں کسی شئے کے وجود کا یقین خود اس کے مشاہدے سے نہیں بلکہ اس کے آثار کے مشاہدے کی بنا پر ہوا ہے۔ گویا اس میں تعقّل وتفکر اور استدلال اور استنباط و استنتاج کا واسطہ پایا جاتا ہے۔ دوسرا درجہ یہ ہے کہ آپ خود آگے بڑھ کر اپنی آنکھ سے آگ کا مشاہدہ کر لیں، یہ عین الیقین ہے اور اس میں یقین کی شدّت پہلے کی نسبت یقیناً بہت زیادہ ہے تاہم ع : "آنچہ می بینم ببیداریست یارب یا بخواب!" کے مصداق ایک امکان باقی رہتا ہے کہ شاید وہ صرف صورت نار ہو فی الواقع نار نہ ہو۔ لیکن اگر اس آگ کی کوئی چنگاری اڑ کر آپ کی جلد پر پڑ جائے اور اس کی جلن اور سوزش آپ خود محسوس کر لیں تو اب یہ وسوسہ بھی ختم ہو جاتا ہے اور یقین اپنے تکمیلی درجے کو پہنچ جاتا ہے۔ یہ ہے حق الیقین کا درجہ —— !!

چنانچہ یہی فرق وتفاوت ایمان کے مراتب و مدارج کے درمیان بھی پایا جاتا ہے۔ اور اس ایمان سے قطع نظر جس میں ساری بحث 'اِقرار باللّسان' اور 'شہادت' سے ہے، تصدیق قلبی زیرِ بحث ہی نہیں آتی، حقیقی ایمان کے بھی بے شمار مراتب و

مدارج ہیں۔ چنانچہ ایک ایمان ہما شما کا ہے اور ایک ایمان صدّیقِ اکبر حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا ـــــ اور پھر ایک ایمان خود رسولِ اکرم صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کا بفحوائے الفاظِ قرآنی: "اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَیْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَالْمُؤْمِنُوْنَ" یعنی "ایمان لائے رسول صلّی اللہ علیہ وسلّم اس پر کہ جو نازل کیا گیا اُن پر اُن کے ربّ کی جانب سے اور ایمان لائے اہلِ ایمان!" ـــــ اور ان کے مابین نسبت و تناسب کا معاملہ بالکل وہی ہے کہ "چہ نسبت خاک را با عالمِ پاک!"۔ گویا ایمان کے مابین مراتب و مدارج بے شمار ہیں۔ البتہ اس کو اُصولی طور پہ دو درجوں میں منقسم کیا جا سکتا ہے: ایک اپنی نوعیّت کے اعتبار سے علم الیقین ہے اور دوسرا عین الیقین اور حق الیقین کا مجموعہ۔

واضح رہے کہ یوں تو اُمورِ ایمانی جہت سے ہیں، لیکن اصلاً ایمان نام ہے ایمان باللہ کا اور ایمان بالآخرت ہو یا ایمان بالرّسالت یہ دونوں ایمان باللہ ہی کی فروع (COROLLORIES) ہیں۔ اس لئے کہ آخرت مظہر ہے اللہ کی صفتِ عدل کی اور رسالت مظہر ہے صفتِ ہدایت کی ـــــ اب ایمان باللہ کا ایک درجہ تو یہ ہے کہ انسان اللہ کے وجود اور اس کی صفات کو ان کے مظاہر و آثار سے مستنبط کرے بقولِ شاعر: ع

"حق مری دسترس سے باہر ہے، حق کے آثار دیکھتا ہوں میں!" ـــــ یہ علم الیقین کا درجہ ہے ـــــ یعنی معرفتِ الٰہی بذریعہ مشاہدۂ آیاتِ الٰہی اور واقعہ یہ ہے کہ نوعِ انسانی کی ایک عظیم اکثریّت کی رسائی بس یہیں تک ہو سکتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایمان باللہ کے ضمن میں قرآن نے اسی اسلوب کو بتکرار و اعادہ اختیار فرمایا ہے۔ چنانچہ مکّی سورتوں میں وہ مضامین بکثرت اور شرح و بسط کے ساتھ بیان ہوئے ہیں جن کا خلاصہ سورۂ بقرہ کی آیت ۱۶۴ میں ایسی جامعیّت کے ساتھ آیا ہے کہ اگر اسے "آیت الآیات" قرار دیا جائے تو غلط نہ ہوگا۔

اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّهَارِ وَالْفُلْكِ الَّتِیْ تَجْرِیْ فِی الْبَحْرِ بِمَا یَنْفَعُ النَّاسَ وَمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ مَّآءٍ	(یعنی) بے شک آسمانوں اور زمین کی تخلیق میں اور رات اور دن کے اُلٹ پھیر میں اور اس کشتی میں جو لوگوں کے لئے نفع بخش سامان لئے دریا میں چلتی ہے، اور اللہ نے آسمان سے جو پانی اُتارا اور زندہ کر دیا اُس سے زمین کو اُس کے مردہ ہونے

فَاَحْيَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا	کے بعد اور پھیلا دیئے اُس میں تمام اقسام کے
وَبَثَّ فِيْهَا مِنْ كُلِّ دَآبَّةٍ وَّ	جانور، اور ہواؤں کے چلنے میں اور بادل میں
تَصْرِيْفِ الرِّيٰحِ وَالسَّحَابِ	جو مسخّر ہے آسمان اور زمین کے درمیان نشانیاں
الْمُسَخَّرِ بَيْنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ	ہیں عقل سے کام لینے والوں کے لئے !
لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ○	

الغرض آیاتِ آفاقی پر تعقّل و تفکّر کے ذریعے بھی یقیناً ایمانِ حقیقی پیدا ہوتا ہے، لیکن یہ ہے بہرحال 'علم الیقین' ہی کے درجے میں، اور یہ سمجھنا غلطی ہی نہیں بہت بڑی گمراہی ہے کہ ایمان باللہ کا آخری درجہ یہی ہے۔ اللہ کی ہستی اور اُس کے وجود کا یقین انسان کو 'عین الیقین' بلکہ 'حق الیقین' کے درجے تک بھی حاصل ہو سکتا ہے بشرطیکہ انسان بفحوائے الفاظِ قرآنی : وَفِيْٓ اَنْفُسِكُمْ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ ○ اور بقول علّامہ اقبال مرحوم ؏ : " اپنے من میں ڈوب کر پا جا سُراغِ زندگی !" اپنے باطنی شعور کو اُجاگر کرے اور دل کی آنکھ سے جمالِ الٰہی کا مشاہدہ کرے۔ چنانچہ یہی وہ بات ہے جسے علّامہ اقبال مرحوم نے اپنے اس جدید علم الکلام کی اساس بنایا ہے جس کے اصول و مبادی انہوں نے اپنے مشہورِ زمانہ لیکچرز میں معیّن کرنے کی کوشش کی ہے۔ یعنی یہ کہ مشاہدہ صرف خارجی نہیں ہوتا باطنی بھی ہوتا ہے ـــ اور تجربہ صرف مادّی اور حسّی ہی نہیں ہوتا قلبی و روحانی بھی ہوتا ہے اور اس حسِّ باطنی کے اعتبار سے ایمان باللہ معقولات اور تصوّرات کے دائرے سے نکل کر محسوسات و مشاہدات کے دائرے میں آجاتا ہے، اور ایمان بندۂ مومن کا قال ہی نہیں حال بن جاتا ہے ؎

یہ بات کہ ایمان 'عین الیقین' اور 'حق الیقین' کے درجے کو پہنچ سکتا ہے صحابۂ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین کے احوال سے نورِ روزِ روشن کی طرح ثابت ہے ہی، نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم کی اس مشہور اور متّفق علیہ حدیث سے نقلاً بھی ثابت ہے جسے 'حدیثِ جبریل' سے موسوم کیا جاتا ہے اور جسے محدّثین نے اُس کے مضامین کی اہمیّت اور جامعیّت کے پیشِ نظر " اُمُّ السُّنَّۃ " قرار دیا ہے۔ اس میں حضرت جبریل علیہ السّلام کے اس سوال کے جواب میں کہ : " اخبرني عن الاحسان ! " یعنی : " مجھے احسان کے بارے میں بتائیے ! " ـــ آنحضور صلّی اللہ علیہ وسلّم نے ارشاد فرمایا :

"اَنْ تَعْبُدَ اللّٰهَ کَاَنَّکَ تَرَاہُ!" ــ یعنی "یہ کہ تو اللہ کی اطاعت و عبادت میں اس شدّتِ یقین سے سرگرم ہو جائے کہ جیسے تو اُسے اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہو!"

الغرض یہ ہے ایمان باللہ کا وہ درجہ جسے 'عین الیقین' اور 'حق الیقین' سے تعبیر کیا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ جہاں پہنچ کر انسان خود مجسّم یقین بن جاتا ہے، اور یقین انسان کے روئیں روئیں سے پھوٹنے لگتا ہے۔ چنانچہ نہ یہ بات غلط ہے کہ: ؎

"نگاہِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں!" ــ اور نہ ہی یہ کوئی انہونی بات ہے کہ:

"یقیں پیدا کر اے ناداں! یقیں سے ہاتھ آتی ہے ٭ وہ درویشی کہ جس کے سامنے جھکتی ہے فغفوری!"

ــ البتہ یہاں تک رسائی ہر کس و ناکس کو حاصل نہیں ہو سکتی، یہ درجہ صرف خواص کا ہے اور ظاہر ہے کہ: "وَقَلِیْلٌ مَّا ھُمْ"

یہاں مختصراً یہ بھی بیان ہو جائے تو مناسب رہے گا کہ قرآنِ حکیم ایمان بالآخرت کے ضمن میں خاص طور پر "یقین" کا ذکر کیوں کرتا ہے۔ دراصل عوامی سطح پر انسانوں کے عمل پر سب سے گہری چھاپ جس ایمان کی پڑتی ہے وہ ایمان بالآخرت ہی ہے۔ لہٰذا وہ عوام النّاس بھی جن کا ایمان ابھی "اقرار" باللسان یا شہادت ہی کے درجے میں ہو اپنے عمل کی درستی کے لئے محتاج ہیں کہ کم از کم آخرت کے ضمن میں اُن کا ایمان "علم الیقین" کے درجے کو لازماً پہنچ جائے ورنہ ایمان کے کوئی اثرات اُن کے افعال و اعمال پر قطعاً مترتّب نہ ہوں گے ــــ یہی وجہ ہے کہ سورۂ بقرہ کے آغاز میں بھی ایمان بالآخرت کے ضمن میں فرمایا: "وَبِالْاٰخِرَةِ ھُمْ یُوْقِنُوْنَ ۝" ــ اور اسی طرح سورۂ لقمان کے آغاز میں بھی فرمایا: "وَھُمْ بِالْاٰخِرَةِ ھُمْ یُوْقِنُوْنَ ۝" ۔ اور سورۂ جاثیہ میں بھی منکرین قیامت کے ذکر میں فرمایا:

وَاِذَا قِیْلَ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّالسَّاعَةُ لَا رَیْبَ فِیْهَا قُلْتُمْ مَّا نَدْرِیْ مَا السَّاعَةُ اِنْ نَّظُنُّ اِلَّا ظَنًّا وَّمَا نَحْنُ بِمُسْتَیْقِنِیْنَ ۝

(یعنی) اور جب کہا گیا کہ اللہ کا وعدہ حق ہے اور قیامت کے وقوع میں کوئی شک نہیں تو تم نے کہا: "ہم نہیں جانتے قیامت کیا ہے، صرف ایک خیال سا تو ہمیں ہوتا ہے، لیکن یقین نہیں آتا!"

قصّہ مختصر نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم اور قرآنِ حکیم کے حوالے سے بات ہو تو یقین کے

لئے وسیع تر اور کثیر الاستعمال اصطلاح تو ایمان ہی کی ہے لیکن ایمان کا جو پہلو انسانی شخصیت کے سعی و عمل والے پہلو سے متعلق ہے وہ یقین قلبی سے عبارت ہے، اور اس کا لازمی نتیجہ وہ ہے جسے قرآن جہاد یا مجاہدہ فی سبیل اللہ سے تعبیر کرتا ہے۔

ایمان اور جہاد کے باہمی لزوم کے ضمن میں اس سے قبل قرآنِ حکیم کے تین مقامات کا حوالہ دیا جا چکا ہے لیکن ان میں سے اہم ترین مقام سورہ حجرات کی آیت ۱۵ ہے جس میں "مومنِ حقیقی" کی "جامع و مانع" تعریف بیان ہوئی ہے۔ اس لئے بھی کہ اس کے آغاز و اختتام دونوں پر حصر کا اسلوب موجود ہے۔ یعنی آغاز بھی ہے کلمۂ "انّما" سے اور اختتام پر بھی اسم اشارہ "اُولٰٓئِکَ" پر اضافہ فرمایا گیا ہے اسم ضمیر "ھُمُ" کا۔ گویا ترجمہ ہوگا کہ: "مومن تو بس وہی ہیں!" اور: "صرف وہی لوگ سچے ہیں!" — اور اس لئے بھی کہ اس سے قبل والی آیت یعنی آیت ۱۴ میں قرآن کے عام طرزِ بیان کے خلاف 'ایمان' اور 'اسلام' کا ذکر مقابلۃً کیا گیا ہے اور ایک کی نفی کُلّی کے باوصف و باوجود دوسرے کا اثبات کیا گیا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

قَالَتِ الْاَعْرَابُ اٰمَنَّا ؕ قُلْ لَّمْ	(یعنی) یہ بدّو کہتے ہیں ہم ایمان لے آئے (اے
تُؤْمِنُوْا وَلٰكِنْ قُوْلُوْٓا اَسْلَمْنَا وَلَمَّا	نبی!) کہہ دیجئے کہ تم ایمان ہرگز نہیں لائے
يَدْخُلِ الْاِيْمَانُ فِيْ قُلُوْبِكُمْ ؕ	ہو، بلکہ یوں کہو کہ ہم اسلام لے آئے ہیں اور
وَاِنْ تُطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ لَا	ابھی تک تو ایمان تمہارے دلوں میں داخل بھی
يَلِتْكُمْ مِّنْ اَعْمَالِكُمْ شَيْـًٔا ؕ	نہیں ہوا۔ البتّہ اگر تم اللہ اور اس کے رسولؐ
اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝	کی اطاعت پر کاربند رہو تو تمہارے اعمال (کے

اجر و ثواب) میں سے کچھ کم نہ کرے گا۔ یقیناً اللہ بخشنے والا ہے، رحم فرمانے والا — !!

اس سلسلۂ کلام میں آپ سے آپ یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ پھر حقیقی ایمان کسے کہتے ہیں اور حقیقی مومن کی تعریف کیا ہے؟ — چنانچہ اس سوال کا جواب ہے جو اگلی آیت میں دیا گیا۔ یعنی:

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا	(یعنی) مومن تو بس وہ ہیں جو ایمان لائے
بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوْا	اللہ پر اور اُس کے رسول پر، پھر شک میں
وَجٰهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ	نہیں پڑے، اور جہاد کیا انہوں نے اپنے

فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِؕ اُولٰٓئِکَ ھُمُ الصّٰدِقُوْنَ ۝ (حجرات : ۱۵)	اموال اور اپنی جانوں کے ساتھ اللہ کی راہ میں صرف یہی لوگ (دعوئ ایمان میں) سچے ہیں!

اِس آیۂ مبارکہ میں "لَمْ یَرْتَابُوْا" کے الفاظِ مبارکہ نے ایمان کے "یقین" والے پہلو کو بالکل متعین کر دیا ہے، اور اس کے بعد کے الفاظ نے واضح کر دیا ہے کہ ایمانِ حقیقی کا لازمی نتیجہ جہاد و مجاہدہ فی سبیل اللہ ہے ۞

جہاد یا مجاہدہ — 'جُہد' کے مادّے سے باب مفاعلہ کا مصدر ہے، جس کے خواص میں مشارکت بھی ہے اور مقابلہ بھی (یعنی ایک ایسی عملی کیفیت جس میں دو فریق شریک ہوں اور ایک دوسرے سے بازی لے جانے یا ایک دوسرے کو زک پہنچانے کے درپے ہوں) - جیسے قتل ایک یکطرفہ فعل ہے جس میں ایک انسان دوسرے انسان کو قتل کر دیتا ہے بغیر اس کے کہ وہ بھی اس کے قتل کا ارادہ رکھتا ہو - جبکہ قتال یا مقاتلہ ایک دوطرفہ عمل ہے جس میں دو فریق ایک دوسرے کے قتل کے ارادے ہی سے میدان میں اترتے ہیں - اسی طرح بحث ایک یکطرفہ فعل ہے جس میں ایک شخص کسی مسئلے کے بارے میں کھود کرید کر رہا ہوتا ہے — اور مباحثہ میں دو فریق شریک ہوتے ہیں اور دونوں اپنے موقف کو درست اور فریقِ مقابل کے موقف کو غلط ثابت کرنے پر تلے ہوتے ہیں - اسی طرح 'جُہد' ایک یک طرفہ عمل ہے جس کا ترجمہ اردو یا فارسی میں 'کوشش' ہوگا - جب کہ جہاد یا مجاہدہ ایک دو طرفہ عمل ہے جس کا ترجمہ اردو یا فارسی میں 'کشمکش' ہوگا اور انگریزی میں — TO STRUGGLE

ایمانِ حقیقی یا یقینِ قلبی کے نتیجے میں جو کشمکش یا تصادم پیدا ہوتا ہے اُس کا اوّلین میدان کار انسان کی اپنی داخلی شخصیت ہے - جیسے ہی انسان کے قلب و ذہن نورِ ایمان سے منوّر ہوتے ہیں، اُس کے سفلی جذبات و خواہشات کے طوفان اس روشنی کو گل کرنے کے درپے ہو جاتے ہیں - انسان کی حیوانی شخصیت یا LIBIDO کی گہرائیوں اور اُس کے اندھیاروں کا مشاہدہ دَورِ جدید کے علمائے نفسیات نے خوب کیا ہے، اور اس میں ہرگز کوئی شک نہیں کہ ان کی کیفیت فی الواقع وہی ہے جو قرآنِ حکیم کی اس تمثیل میں بیان ہوئی کہ:

اَوْ كَظُلُمٰتٍ فِیْ بَحْرٍ لُّجِّیٍّ	یا جیسے اندھیرے گہرے سمندر میں، چھائی ہوئی
یَّغْشٰهُ مَوْجٌ مِّنْ فَوْقِهٖ مَوْجٌ	ہو اس پر ایک موج، اور اس پر پھر ایک
مِّنْ فَوْقِهٖ سَحَابٌؕ ظُلُمٰتٌۢ	اور موج، اور پھر اس پر ایک بدلی، گویا

بَعْضُهَا فَوْقَ بَعْضٍ ط (النور - ۴۰) اندھیرے ہوں بعض پر بعض، تہ در تہ!

اس پس منظر میں بخوبی سمجھا جا سکتا ہے کہ جیسے ہی انسان کے قلب و ذہن میں نورِ ایمان و یقین کی شمع روشن ہوتی ہے۔ شہوات و خواہشات کی ظلمات کے ساتھ اس کی کشمکش شروع ہو جاتی ہے۔ چنانچہ یہی وہ جہاد یا مجاہدہ ہے جسے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے افضل الجہاد قرار دیا ہے۔ یعنی جب آپؐ سے سوال کیا گیا کہ: "اَیُّ الْجِھَادِ اَفْضَلُ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ ؟" تو آپؐ نے ارشاد فرمایا: "اَنْ تُجَاھِدَ نَفْسَکَ فِیْ طَاعَۃِ اللّٰہِ"

اس جہاد میں جب اللہ انسان کو کامیابی عطا فرما دیتا ہے اور انسان کے نفسِ امّارہ پر قلب و روح کی تجلیات غالب آجاتی ہیں تو اس کا اوّلین نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ انسان کا اپنا عمل درست ہو جاتا ہے۔ گناہ اور معصیت سے نجات مل جاتی ہے اور انسانی شخصیت خیرات و حسنات کی آماج گاہ بن جاتی ہے۔ چنانچہ یہی وہ حقیقت ہے جو قرآن میں بھی بے شمار مقامات پر ایمان کے فوراً بعد عملِ صالح کے ذکر کے ذریعے واضح کی گئی ہے اور حدیث شریف میں بھی مثبت پیرائے میں بھی بیان ہوئی ہے۔ یعنی مثلاً اس سوال کے جواب میں کہ: اَیُّ الْاِیْمَانِ اَحْسَنُ ؟ (یعنی اچھا ایمان کون سا ہے) آپؐ نے فرمایا: "خُلُقٌ حَسَنٌ" یعنی "وہ جس کے نتیجے میں اخلاقِ حسنہ پیدا ہوں" — اور منفی پیرائے میں بھی بیان ہوئی ہے۔ جیسے وہ مشہور روایت جس کی رُو سے حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ کبھی شاذ ہی ایسا ہوا ہوگا کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہمیں خطبہ ارشاد فرمایا اور اس میں یہ الفاظ نہ فرمائے ہوں کہ:

"لَا اِیْمَانَ لِمَنْ لَا اَمَانَۃَ لَہٗ وَلَا دِیْنَ لِمَنْ لَا عَھْدَ لَہٗ" — (یعنی جس شخص میں امانتداری نہیں اس کا ایمان نہیں اور جس میں ایفائے عہد کا مادّہ نہیں اس کا کوئی دین نہیں!) — یا وہ مشہور اور متفق علیہ حدیث جس کی رُو سے آپ نے فرمایا: "وَاللّٰہِ لَا یُؤْمِنُ — وَاللّٰہِ لَا یُؤْمِنُ — وَاللّٰہِ لَا یُؤْمِنُ !" (خدا کی قسم وہ مومن نہیں۔ خدا کی قسم وہ مومن نہیں۔ خدا کی قسم وہ مومن نہیں!) — پوچھا گیا: "من یا رسول اللّٰہ" (حضور کون؟) تو آپؐ نے فرمایا: "اَلَّذِیْ لَا یَاْمَنُ جَارُہٗ بَوَائِقَہٗ !" (یعنی وہ کہ جس کی ایذا رسانیوں سے اس کا پڑوسی امن میں نہ ہو!)

الغرض — ایمان جب یقینِ قلبی کی صورت اختیار کرتا ہے — تو اس کا پہلا

نتیجہ نکلتا ہے عمل کی درستی اور انسانی شخصیت کی تزئین و آرائش عاداتِ حسنہ، اور اخلاقِ فاضلہ سے، اور اس کے بعد شروع ہوتا ہے عالمِ خارجی میں جہاد یا مجاہدہ فی سبیل اللہ کا سلسلہ۔

اس جہاد فی سبیل اللہ کا اوّلین قدم وہ ہے جسے سورۃ العصر میں تعبیر فرمایا گیا "تواصی بالحق" اور "تواصی بالصّبر" سے یا سورۂ بلد میں بیان کیا گیا "تواصی بالصّبر" اور "تواصی بالمرحمہ" کے الفاظ سے، یا متعدّد مقامات پر بیان کیا گیا "امر بالمعروف" اور "نہی عن المنکر" کی اصطلاحات کے حوالے سے یا کہیں تعبیر فرمایا گیا "دعوت الی الخیر" یا "دعوت اِلَی اللہ" کے الفاظ سے ــــ اللہ اور آخرت پر ایمان و یقین کے نور کو جیسے ہی انسانی شخصیت میں تمکّن و قرار حاصل ہوجاتا ہے اس کا ظہور آپ سے آپ خارج میں بھی شروع ہوجاتا ہے۔ بالکل ایسے جیسے کوئی مادّی چیز جب خود گرم ہوجائے تو اس سے حرارت خود بخود ماحول میں سرایت کرنا شروع کردیتی ہے۔ اور پھر جیسے جیسے اس کی حرارت میں اضافہ ہوتا جاتا ہے، ماحول میں حرارت کا اثر و نفوذ بھی بڑھتا چلا جاتا ہے۔ البتہ اُس میں ایک اضافی شدّت پیدا ہوتی ہے ایمان بالرّسالت کے حوالے سے۔ یعنی یہ کہ برائی کے خلاف جہاد اور خیر اور بھلائی کی جانب دعوت تو عین انسانی فطرت کا بھی تقاضا ہے اور ایمان باللہ اور ایمان بالآخرت سے اس میں مزید نکھار بھی پیدا ہوجاتا ہے لیکن جب کوئی نبی یا رسول مامور من اللہ ہوکر اس فریضے کو سرانجام دیتا ہے تو اس کا ہدف و مقصود یہ بن جاتا ہے کہ خلقِ خدا پر اتمامِ حُجّت ہوجائے اور لوگ محاسبۂ اُخروی کے وقت کوئی عذر پیش نہ کرسکیں بفحوائے الفاظِ قرآنی:

رُسُلًا مُّبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ لِئَلَّا يَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَى اللّٰهِ حُجَّةٌ بَعْدَ الرُّسُلِ ط (سورۂ نساء آیت ۱۶۵)

(یعنی رسول بشارت دینے والے اور خبردار کردینے والے بنا کر بھیجے گئے تاکہ رسولوں کے بعد لوگوں کے پاس اللہ کے سامنے کوئی دلیل باقی نہ رہ جائے)

اسے اصطلاحِ قرآنی میں "شہادت علی النّاس" سے تعبیر کیا گیا ہے اور اسی کو اب آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم پر ختمِ نبوّت اور تکمیلِ رسالت کے بعد اُمّتِ مُسلمہ کا مقصدِ وجود قرار دیا گیا ہے ــــ بفحوائے الفاظِ قرآنی: (البقرہ: ۱۴۳)

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا	(یعنی) اسی طرح ہم نے بنایا ہے تمہیں درمیانی
لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ	اُمّت تاکہ تم بن جاؤ گواہ پوری نوعِ انسانی
وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا ؕ	پر ـــــ اور رسول بن جائیں گواہ تم پر!

اور اسی کے لئے سعی و جہد اور جہاد و مجاہدہ کے لئے للکارا گیا ہے مسلمانوں کو سورۂ حج کی اس آخری آیت میں جس کے آغاز میں فرمایا :

وَجَاهِدُوْا فِى اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ	اور جہاد کرو اللہ کے لئے جیسا کہ اس کے لئے
هُوَ اجْتَبٰكُمْ	جہاد کا حق ہے۔ اُس نے تمہیں (اس مقصد
	کے لئے) منتخب کر لیا ہے۔

اور آخر میں اس کا ہدف و مقصود معیّن کر دیا گیا ان الفاظ میں کہ : لِيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ شَهِيْدًا عَلَيْكُمْ وَتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ۔ (تاکہ بن جائیں رسولؐ گواہ تم پر۔ اور بن جاؤ تم گواہ پوری نوعِ انسانی پر! ـــــ اور اس پر بھی اکتفا نہیں۔ اس جہاد و مجاہدہ فی سبیل اللہ کا آخری ہدف اور مقصود ہے وہ جسے سورۂ مدّثر میں تعبیر فرمایا گیا : وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ کے مختصر لیکن نہایت جامعیت اور فصاحت و بلاغت کے حامل الفاظ سے یعنی اللہ کی کبریائی کا اقرار و اعلان اور اس کا بالفعل قیام و نفاذ ـــــ اور جو سورۂ صف، سورۂ فتح اور سورۂ توبہ میں بیان کیا گیا : "اظہار دین الحق علی الدّین کلّہٖ!" کی جامع اصطلاح کے حوالے سے بفحوائے الفاظِ قرآنی : "هُوَ الَّذِىْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ ؕ (یعنی وہی ہے اللہ جس نے بھیجا اپنے رسولؐ کو الہدیٰ یعنی قرآن مجید اور دین حق یعنی اسلام کا نظامِ عدلِ اجتماعی دے کر تاکہ غالب و قائم کر دیں اسے پورے کے پورے نظامِ زندگی پر!)

اور یہ امر ظاہر ہے کہ ایک عظیم انقلاب کا متقاضی ہے ـــــ جس کے لئے ایک بھرپور انقلابی جدّ و جہد ناگزیر ہے۔ گویا ایمانِ حقیقی یا یقینِ قلبی کا لازمی نتیجہ ہے ایک عظیم انقلابی جدّ و جہد جس سے مقصود آخرت میں جہنّم سے نجات اور رضائے الٰہی کا حصول ہو۔ اور جس کا ہدف اس دُنیا میں وہ ہو جسے آنحضور صلّی اللہ علیہ وسلّم نے تعبیر فرمایا : "لِتَكُوْنَ كَلِمَةُ اللّٰهِ هِىَ الْعُلْيَا" ـــــ کے الفاظ سے، یعنی تاکہ اللہ کا کلمہ ہی سربلند ہو۔ اور اس کے جھنڈے سے اُونچا کوئی جھنڈا نہ رہے۔

آخر میں اگر ایک اور اہم حقیقت کی جانب بھی اشارہ ہو جائے تو بات مکمل ہو جائے گی کہ اس ایمان کا منبع اور یقین کا سرچشمہ ہے قرآنِ حکیم۔ بقول مولانا ظفر علی خاں مرحوم و مغفور ؎

وہ جنس نہیں ایمان جسے لے آئیں دکان فلسفہ سے ❊ ڈھونڈے سے ملے گی عاقل کو یہ قرآں کے سیپاروں میں

یہی وجہ ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا پورا عملِ دعوت و تربیت گھومتا ہے قرآن مجید کے گرد اور آپؐ کی پوری انقلابی جدّوجہد کا مرکز و محور ہے قرآنِ حکیم بفحوائے الفاظِ قرآنی:

يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ

(یعنی) تلاوت کرتا ہے وہ ان پر اللہ کی آیات اور تزکیہ کرتا ہے اُن کا اور تعلیم دیتا ہے انھیں کتاب اور حکمت کی!

گویا آپؐ کا آلۂ انقلاب قرآن مجید ہے!— بقول مولانا حالی مرحوم ؎

اُتر کر حرا سے سوئے قوم آیا ——— اور اک نسخۂ کیمیا ساتھ لایا

تو اب مردِ مومن کی شخصیت کا جو سیولی چشمِ تصوّر کے سامنے آئے گا اس کے ایک ہاتھ میں قرآن ہوگا اور دوسرے میں تلوار— قرآن خود اس کے ذاتی یقین کا منبع و سرچشمہ بھی ہے اور اس کے ذریعے وہ دُنیا سے جہالت کی تاریکیاں فرو کرتا ہے اور تلوار علامت (SYMBOL) ہے اُس کے جذبۂ سعی و عمل اور جوشِ جہاد و قتال فی سبیل اللہ کے لئے— اور اس کا مطلوب و مقصود ہے حضرت سعد ابن ابی وقاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے الفاظ کی رُو سے:

إِنَّا أُرْسِلْنَا لِنُخْرِجَ النَّاسَ مِنْ ظُلُمَاتِ الْجَهَالَةِ إِلَىٰ نُورِ الْإِيمَانِ وَمِنْ جَوْرِ الْمُلُوكِ إِلَىٰ عَدْلِ الْإِسْلَامِ

ہم اس لئے بھیجے گئے ہیں کہ لوگوں کو نکالیں جہالت کی تاریکیوں سے ایمان کی روشنی کی جانب اور نجات دلائیں انہیں بادشاہوں کے ظلم و ستم اور روشناس کریں اسلام کے نظامِ عدل سے

گویا بقول ملک نصر اللہ خاں عزیز مرحوم ؎

"مری زندگی کا مقصد تیرے دیں کی سرفرازی ❊ میں اسی لئے مسلماں میں اسی لئے نمازی!"

إِنَّ صَلَاتِي وَنُسُكِي وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِي لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝
وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝

بقیہ سلسلۂ نوربخشیہ

از صہ

فقہی مسائل پر مشتمل کتاب ہے اور اس میں فقہی مسائل مندرج ہیں نہ کہ عقائد ی ـــ عقائد کے سلسلے میں "اصولِ عقائد" نامی کتاب ہے، وہ بھی خود حضرت سید محمد نوربخش کی اپنی تصنیف ہے اور فیروز سنز لاہور سے چھپ چکی ہے ـــ اس سے معلوم ہوا کہ یہ بات غلط ہے کہ نوربخشی عقائد 'احوط' نامی کتاب میں ہیں بلکہ اس کتاب کا نام ہی "فقہ احوط" ہے اور فقہی مسائل پر بحث کی ہے۔ عقائد کی کتاب جیسا کہ اوپر لکھ چکا ہوں "اصولِ عقائد" نامی کتاب ہے ـــ اس کے ساتھ ہی یہ بھی ذہن نشیں رہے کہ نوربخشی سلسلے کا قرامطہ، اسماعیلیہ، باطنیہ نزاریہ اور شیعہ وغیرہ سے کوئی تعلق ہے، اور یہ کہ نوربخشی لوگ عقیدۂ بدأ، رجعت تناسخ حلول، تجسیم، تاویل اور اوتار وغیرہ، اس قسم کا کوئی عقیدہ نہیں رکھتے ہیں۔ بلکہ یہ ایسا ہی ہے جیسا ہمارے اہلِ سُنّت میں چشتیہ، قادریہ، سہروردیہ اور نقشبندیہ ہیں اور یہ کہ نوربخشی اپنے سلسلے کو ان سلسلوں سے الگ نہیں سمجھتے بلکہ ایک سمجھتے ہیں۔ جیسا کہ حضرت سید محمد نوربخش کے سلسلہ سے آپ کو معلوم ہوگا، حضرت سید محمد نوربخش رح کا سلسلہ اس طرح ہے "سید محمد نوربخش رح، خواجہ اسحاق ختلانی، سید علی ہمدانی رح، شیخ محمود مزدقانی، علاؤالدولہ سمنانی، عبدالرحمٰن اسفرائنی، احمد ذاکر جورجانی، شیخ علی ابن لالہ، شیخ نجم الدین کبرائی، شیخ عماد بدلیسی، ابونجم سہروردی، شیخ ابوذر رودباری، شیخ سری سقطی، شیخ معروف کرخی، حضرت علی رضا تا حضرت خاتم الانبیاء محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم!" ـــ

(بحوالہ دعوت الصوفیہ صنعہ و فلاح المؤمنین صہ ۳۲)

نوربخشی شریعتِ محمدی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے حامل اور اتباعِ رسول مقبول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قائل ہیں اور اسی پہ ان کا ایمان ہے۔ چنانچہ حضرت سید محمد نوربخش رح فرماتے ہیں :

ہرچہ ضدِ شرع باشد باطل است ✤ حرفِ بے مغز آں ہمہ لاطائل است
پس شما ایں راہ را تابع شوید ✤ سوئے مسلک ہائے دیگر منگرید
ایں شرف را داشت موقوف اے ذکی ✤ حق تعالیٰ بر تبعیتِ راہِ نبی

درس سورۃ العصر

مولانا عبدالغفار حسن مدظلہ

وَالْعَصْرِ ۝ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ ۝ اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ ۝

یہ مختصر سی سورت جو اس وقت تلاوت کی گئی ہے اس کا نام سورۃ العصر ہے اس کے تلاوت کرنے کا مقصد یہ ہے کہ قرآن مجید سے ہمارا تعلق قائم ہو اور اسے سمجھنے، اور سمجھانے کا شوق پیدا ہو۔ یہ سورت اور اسی طرح کی دوسری چھوٹی چھوٹی سورتیں عام طور پر نمازوں میں پڑھی جاتی ہیں۔ لیکن پڑھنے والوں اور سننے والوں کو کچھ معلوم نہیں ہوتا کہ ان کا مطلب کیا ہے، ان کا ترجمہ کیا ہے اور ان کے ہم سے تقاضے کیا ہیں؛ حلال کیا ہے؟ حرام کیا ہے؟ اللہ تعالیٰ کو کیا کام پسند ہیں، کیا ناپسند ہیں؟ تو خاص سورۃ العصر ہی کیا پورا قرآن مجید ہم پڑھتے رہتے ہیں لیکن اسے سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے قرآن کا پہلا حق یہ ہے کہ اُسے ٹھیر ٹھیر کر اطمینان کے ساتھ پڑھا جائے۔ رمضان میں آپ جب تراویح میں قرآن مجید سُنتے ہیں تو بہت سے حافظ اُسے اِس طرح پڑھتے ہیں کہ صرف 'یَعْلَمُوْنَ'۔ 'تَعْلَمُوْنَ' ہی سننے میں آتا ہے اور کچھ خبر نہیں ہوتی کہ کیا پڑھا گیا حالانکہ قرآن مجید میں آتا ہے: وَرَتِّلِ الْقُرْاٰنَ تَرْتِیْلًا ۔ کہ آپ پڑھیے قرآن مجید کو ٹھیر ٹھیر کر، اطمینان کے ساتھ ــــ ایک دوسری آیت میں فرمایا: وَقُرْاٰنًا فَرَقْنٰهُ لِتَقْرَاَهٗ عَلَى النَّاسِ عَلٰى مُكْثٍ وَّنَزَّلْنٰهُ تَنْزِيْلًا ۝ (سورۃ بنی اسرائیل آیت ۱۰۶)

کہ ہم نے اس قرآن مجید کو اُتارا تاکہ آپ اسے ٹھیر ٹھیر کر اطمینان سے پڑھیں۔ یہ قرآن مجید کا پہلا حق ہے۔ اُس کے ادب اور احترام کا تقاضا ہے کہ اُسے انتہائی عاجزی کے ساتھ، انتہائی خشوع و خضوع کے ساتھ یہ سمجھ کر پڑھا جائے کہ یہ ربّ العالمین کا کلام ہے، احکم الحاکمین کا کلام ہے، اس ہستی کا کلام ہے جس کے قبضہ میں آسمان و زمین ہیں، جو ساری

کائنات کا خالق و مالک ہے۔ اُس کے کلام کو پڑھتے ہوئے آدمی کے جسم پہ لرزہ طاری ہونا چاہیئے کپکپی طاری ہونی چاہیئے۔ نہ کہ یہ کیفیت کہ قرآن مجید پڑھے اور اُسے معلوم ہی نہ ہو کہ کیا پڑھا۔ پھر آپ نے یہ بھی دیکھا ہوگا کہ قاری حضرات خصوصاً مصری قاری جب قرآن مجید پڑھتے ہیں تو لوگ اس طرح داد دیتے ہیں اور بعض اوقات تالیاں بجاتے ہیں جیسے مشاعرہ ہو رہا ہو۔ حالانکہ قرآن مجید سننے کے بعد دل کانپ اٹھنے چاہئیں، ڈر جانے چاہئیں۔ جیسا کہ فرمایا "وَجِلَتْ قُلُوْبُهُمْ"۔ سورۃ انفال میں فرمایا "وَاِذَا تُلِيَتْ عَلَيْهِمْ اٰيٰتُهٗ زَادَتْهُمْ اِيْمَانًا وَّعَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ ۝" (آیت ۲) اور جب اللہ کی آیتیں پڑھی جاتی ہیں تو ایمان میں اضافہ ہوتا ہے، ایمان بڑھ جاتا ہے، لیکن جب آپ اسے سن کر داد دیں گے، تالیاں بجائیں گے، جس طرح شعراء کو داد دی جاتی ہے جب آپ اسے مشاعرہ بنا دیں گے تو ظاہر ہے کہ یہ ایمان بڑھے گا کہاں، گھٹ جائے گا۔ تو قرآن مجید کا پہلا حق یہ ہوا کہ اسے اطمینان سے ٹھیر ٹھیر کر پڑھا جائے۔ چاہے آپ اسے تراویح میں پڑھیں یا ویسے ہی تلاوت کریں، بہرحال جلد بازی سے پرہیز کیا جائے۔

قرآن مجید کا صرف پڑھ لینا ہی کافی نہیں بلکہ ہم پر اور تمام مسلمانوں پر اس کا دوسرا حق یہ ہے کہ اسے سمجھا جائے کہ قرآن مجید کے ہم سے تقاضے کیا ہیں؟ وہ ہم سے کیا مطالبہ کرتا ہے، جیسا کہ فرمایا: كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ مُبٰرَكٌ لِّيَدَّبَّرُوْٓا اٰيٰتِهٖ وَلِيَتَذَكَّرَ اُولُوا الْاَلْبَابِ ۝ (سورۃ ص۔ آیت ۲۹): کہ ہم نے برکت والی کتاب اس لئے اُتاری ہے تاکہ اس سے لوگ نصیحت حاصل کریں اور اس کی آیات میں تدبّر کریں، غور و فکر کریں۔ انہیں معلوم ہو کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک کون سا کام پسندیدہ ہے اور کون سا ناپسندیدہ ہے، کیا چیز حلال ہے اور کیا حرام ہے؟ یہ ساری باتیں قرآن مجید سے معلوم ہوتی ہیں۔ انہیں معلوم کرنے کے لئے ضروری ہے کہ اسے سمجھ کر پڑھا جائے، اسی لئے ایک اور آیت میں فرمایا: اَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ اَمْ عَلٰى قُلُوْبٍ اَقْفَالُهَا ۝ (سورۃ محمد آیت ۲۴) "کیا وہ قرآن مجید میں غور نہیں کرتے؟ کیا اُن کے دلوں پر قفل چڑھے ہوئے ہیں"۔ قرآن مجید بار بار اس بات پر زور دیتا ہے کہ اُسے سمجھا جائے۔ قرآن مجید بار بار اس بات پر زور دیتا ہے کہ اسے سمجھا جائے۔ قرآن مجید کو سمجھنے کے لئے عربی زبان کو سیکھا جائے ورنہ ترجمہ سے اس کو سمجھا جائے، بہرحال اس کا علم حاصل کرنا، اُس کو سمجھنا اور

سمجھانا یہ قرآن مجید کا ہم پر دوسرا حق ہے۔

جب قرآن مجید کو سمجھ لیا تو اس کا تیسرا حق ہم پر یہ ہے کہ اس پر عمل کیا جائے۔ ہمارے تمام فیصلے قرآن مجید کے مطابق ہوں۔ قرآن مجید کی تفسیر کی روشنی میں ہوں جو رسولِ اکرمؐ نے کی ہے۔ اس لئے کہ حدیث اور سُنّت قرآن مجید کی تفسیر ہے۔ رسولِ اکرمؐ پر قرآن مجید نازل ہوا تو جس طرح آپؐ نے اس کا مطلب بیان فرمایا ہے۔ آپؐ نے جو اس کی تفسیر بیان فرمائی ہے یا آپؐ کے صحابہؓ نے آپ سے سُن کر آگے بیان کیا ہے وہ تفسیر قابلِ عمل ہے اور درحقیقت اس کا اہتمام ہونا چاہیئے، اسی کو جاننے کے لئے اور اسی کے حصول کے لئے ہماری کوششیں وقف ہونی چاہئیں۔ سورۂ نساء میں فرمایا: اِنَّآ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِتَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ بِمَآ اَرٰىكَ اللّٰهُ (آیت ۱۰۵) "کہ بے شک ہم نے تاری ہے کتاب حق کے ساتھ تیری طرف (اس میں باطل کی کوئی آمیزش نہیں ہے۔ ساری کتاب حق ہی حق ہے) تاکہ آپ لوگوں کے درمیان فیصلہ کریں ان احکام کی روشنی میں جو اللہ تعالےٰ نے آپ کو بتلائے ہیں!"

سورۃ حٰمٓ سجدہ میں فرمایا: لَا يَاْتِيْهِ الْبَاطِلُ مِنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهٖ ؕ تَنْزِيْلٌ مِّنْ حَكِيْمٍ حَمِيْدٍ ۝ (آیت ۴۲) ۔ یہ اللہ کی کتاب ہے، اس کے نہ آگے سے باطل آسکتا ہے نہ پیچھے سے، اس لئے کہ یہ اُس ہستی کی طرف سے نازل کی گئی ہے جو حکمت والی ہے اور حمد والی ہے یعنی تعریف والی ہے۔ لہٰذا یہ کتاب حق کے ساتھ اُتاری گئی ہے، اس میں حق ہی حق ہے، سچ ہے، صداقت ہے۔ ایسی صورت میں ایک مسلمان کے لئے کیسے جائز ہو سکتا ہے کہ وہ اس کتاب کو پڑھے لیکن اس پر عمل نہ کرے۔ قرآن مجید جس چیز کو حلال ٹھیرائے اُسے حرام سمجھے اور جسے حرام قرار دے اُسے حلال ٹھیرائے۔ اس لئے قرآن مجید کا تیسرا حق ہم پر یہ ہے کہ اس پر عمل کیا جائے۔ پہلا حق تو یہ ہوا کہ انسان ٹھیر ٹھیر کر اطمینان سے اُسے پڑھے۔ بلکہ اس سے بھی پہلے ہے ایمان بالقرآن یعنی یہ کہ قرآن مجید پر ایمان لایا جائے۔ ایمان لایا جائے اس بات پر کہ یہ اللہ کی کتاب ہے اور بڑی عظمت والی ہے۔ زبان سے تو ایمان سب ہی لاتے ہیں۔ لیکن مطلوب ہے دل سے ایمان لانا۔ تو قرآن کا ہم پر پہلا حق ہوا اُس پر دل سے ایمان لانا، دوسرا تلاوتِ قرآن، تیسرا حق ہے اس کو سمجھنا اُس پر تدبّر کرنا اور چوتھا حق اس پر عمل کرنا اور اپنے تمام جھگڑوں اور نزاعات میں اس کو حَکَم

اور سچ ماننا ہے۔ قرآنِ حکیم کے ادب اور اس کے احترام کا یہ تقاضا ہے کہ جب آپ نے اس کو سمجھ لیا، اس پر عمل کر لیا۔ قرآن حکیم بہت بڑی نعمت ہے تو پھر اس نعمت کو دوسروں تک پہنچایا جائے۔ فرمایا: وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ ۝ (سورۃ نحل آیت ۴۴) کہ ہم نے آپ کی طرف ذکر کو نازل کیا۔ (قرآن مجید کا ایک نام ذکر بھی ہے) تاکہ آپ اسے دوسروں تک پہنچائیں، دوسروں کے سامنے بیان کریں کھول کھول کر بیان کریں۔ لیکن افسوس کہ قرآن مجید سے روز بروز ہمارا تعلق کٹتا جا رہا ہے۔ ہم قرآن مجید کے حقوق کو بھولتے جا رہے ہیں۔ اب تو قرآن مجید کے ساتھ ہمارا تعلق یہ رہ گیا ہے کہ اسے عدالتوں میں حلف اٹھانے کے لئے استعمال کیا جاتا ہے حلف چاہے سچا ہو یا جھوٹا۔ یا پھر چور پکڑنے کے لئے قرآن مجید کی آیات کو دیکھا جاتا ہے کہیں سفر کو جا رہے ہوں تو جانے یا نہ جانے کے لئے اس سے فال نکالی جاتی ہے یا پھر اس سے تعویذ گنڈے کئے جاتے ہیں۔ نزلہ زکام، کھانسی، بخار اور دوسرے ظاہری و باطنی امراض کے لئے تعویذ گنڈے دیئے جاتے ہیں جن کی باقاعدہ فیس مقرر ہے۔ اس کا کاروبار خوب چل رہا ہے۔ کوئی تعویذ پانچ روپے کا ہے، کوئی دس کا، کوئی بیس کا۔ اب ہر چیز کی قیمتیں بڑھ رہی ہیں۔ چنانچہ تعویذوں کی قیمتیں بھی بڑھ رہی ہیں۔ قرآن مجید پر لوگوں نے اس قسم کی کتابیں بھی لکھ ڈالی ہیں کہ اس کی فلاں آیت کی فلاں خاصیت ہے اور فلاں کی فلاں۔ !!

اس سے انکار نہیں کہ قرآن مجید سے ظاہری امراض کو بھی شفا نصیب ہوتی ہے جیسا کہ فرمایا: وَنُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْاٰنِ مَا هُوَ شِفَآءٌ وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ۝ (سورۃ بنی اسرائیل آیت ۸۲) ہم قرآن میں سے ایسی آیتیں اُتارتے ہیں کہ جن میں شفا ہے لیکن شفاء کس چیز کی؟ اصل شفاء اس بات کی ہے کہ ہمارے دلوں کی جو بیماریاں اور اُن کے روگ ہیں وہ دُور ہوں۔ اس لئے فرمایا: يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَتْكُمْ مَّوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَشِفَآءٌ لِّمَا فِي الصُّدُوْرِ وَهُدًى وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ۝ (سورۃ یونس آیت ۵۷): اے لوگو! تمہارے پاس تمہارے ربّ کی طرف سے نصیحت آگئی اور اس میں شفا ہے، دوا ہے، علاج ہے سینوں کی بیماریوں کا۔ سینے میں دل ہوتا ہے۔ اس لئے دل میں جو کھوٹ ہے، غلط میلانات ہیں، غلط خیالات ہیں، غلط محبتیں ہیں، غلط نفرتیں ہیں

غلط خواہشات ہیں، غلط عقیدے ہیں، ان کو مٹانے اور ان کی اصلاح کے لئے قرآن مجید کو نازل کیا ہے۔ سینوں اور دلوں میں جو بیماریاں ہیں ان کے لئے قرآن شفاء ہے۔ یہ کون کہتا ہے کہ قرآن کریم پڑھنے سے نزلہ نہیں جائے گا، سر کا درد نہیں جائے گا۔ جائے گا سر کا درد بھی اور نزلہ بھی لیکن کہنے کا مقصود یہ ہے کہ قرآن مجید کے نزول کا مقصد یہ نہیں ہے۔ اس کی مثال یوں سمجھئے کہ یہ ٹوپی ہے جو سر پہ رکھی جاتی ہے، لیکن اگر آپ بازار گئے، آپ نے دیکھا کہ لیموں بک رہے ہیں وہ آپ نے خریدے۔ آپ کے پاس کوئی تھیلا ہے نہیں، آپ نے وہ لیموں ٹوپی میں ڈال لئے تو اس سے آپ کا کام تو چل گیا لیکن ظاہر ہے کہ ٹوپی سر پہ رکھنے کے لئے بنائی گئی ہے لیموں رکھنے کے لئے تو نہیں بنائی گئی۔ یا توپ کی مثال لیجئے اس کے بنانے کا مقصد تو یہ ہے کہ اس کے استعمال سے دشمن کو ختم کیا جائے۔ آپ اگر اس سے مچھر اور مکھی مارنا چاہیں گے تو وہ مر تو جائیں گے، لیکن ظاہر ہے کہ توپ مچھر اور مکھی مارنے کیلئے تو نہیں بنائی گئی۔ اس کا مقصد تو یہ ہے کہ اگر ایک مسلمان مجاہد کے پاس ہو تو وہ اس سے اسلام کے دشمنوں اور دین کے باغیوں کو ختم کرے۔ قرآن حکیم تعویذ گنڈوں کے لئے نازل نہیں کیا گیا۔ جاہلوں میں یہ چیز عام ہے۔ جہاں تعویذ گنڈے ہوتے ہیں وہاں عورتوں کا زیادہ ہجوم ہوتا ہے۔ کسی کو بچے کی طلب ہے، کسی کا کوئی اور مقصد ہے۔ ایک عورت جاتی ہے اور پیر صاحب سے کہتی ہے کہ مجھے ایسا تعویذ دو کہ میری بہو ٹھیک ہو جائے، اور میری تابع ہو جائے۔ دوسری جاتی ہے اور کہتی ہے کہ اس کو ایسا تعویذ بنا دیا جائے کہ اُس کا شوہر اپنی ماں سے فرنٹ ہو جائے اور اُس کا غلام بن جائے۔ ایسے اُلٹے سیدھے تعویذ بھی قرآنِ حکیم سے بنائے جاتے ہیں۔

بعض پیر نقوش بنا کر دیتے ہیں جیسے نقشِ سلیمانی۔ اس طرح قرآن مجید کی آیات کو ایک کھیل بنا لیا گیا ہے۔ کوئی بیمار ہو، سورۃ فاتحہ پڑھ کر دم کر دو، اللہ شفاء دینے والا ہے اس سے انکار نہیں ہے لیکن اس کو سمجھو تو سہی۔ اس کے علاوہ قرآن مجید ایصالِ ثواب کے لئے استعمال ہوتا ہے، جس کا عام رواج ہے، مردوں کو ثواب پہنچانے کے لئے پڑھا جاتا ہے خواہ اُس نے پوری عمر قرآن نہ پڑھا ہو، کھول کر بھی دیکھنے کی توفیق نہ ہوئی ہو۔ مگر مرنے کے بعد اُس کے لئے قرآن خوانی ہوگی۔ میں کہتا ہوں قرآن خوانی کے ساتھ قرآن دانی بھی ضروری ہے

اب قرآن خوانی تو ہوتی ہے، قرآن دانی نہیں ہوتی۔ ابھی ہمارے ایک عزیز کا انتقال ہوا، وہاں پر ہم گئے۔ ایک صاحب نے کہا کہ مرحوم کے لئے گیارہ قرآن ختم کئے گئے۔ میں نے کہا کہ گیارہ قرآن تو ختم کرلئے مگر قرآن میں آتا ہے: "اقیموا الصلوٰۃ" تو اس پر بھی عمل ہوا کہ نہیں؟ تو معلوم ہوا کہ قرآن مجید ختم کرنے والے سو میں سے بمشکل گیارہ آدمی نماز پڑھنے والے ہوں گے۔ تو یہ قرآن مجید بس مردوں کو ثواب پہنچانے کے لئے رہ گیا ہے، زندوں کا اس سے کوئی واسطہ نہیں۔ موت والے دن، سوئم میں، دسویں اور چالسویں میں اُسے پڑھ دو، برسی کے موقع پر اسے پڑھ دو اور بس معاملہ ختم۔ حالانکہ قرآن مجید کے نزول کا مقصد تو یہ تھا کہ اس کو سمجھ کر پڑھا جائے، اس کی تعلیمات پر عمل کیا جائے، زندہ چلتے پھرتے انسانوں کے مردہ دلوں کو زندہ کیا جائے۔ اُن کے اخلاق، اُن کے عقیدے اور اُن کے عمل کی اصلاح کی جائے، اس مقصد کو فراموش کر دیا گیا ہے۔ یہ بھی ہوتا ہے کہ نیا گھر بنایا جائے یا نئی دکان کھول لی جائے تو اُس میں برکت کے لئے قرآن خوانی ہوتی ہے۔ لیکن دکان میں کاروبار کس طرح کا ہوگا اس سے کوئی غرض نہیں۔ بعض لوگ تو غضب کرتے ہیں۔ ایک صاحب نے شراب خانہ کھولا تو اُس کے افتتاح کے موقع پر قرآن مجید کی تلاوت کرادی حالانکہ وہاں تو یہ آیت صادق آتی ہے:

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَیْسِرُ وَالْاَنْصَابُ وَالْاَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّیْطٰنِ فَاجْتَنِبُوْهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۝ (سورۃ المائدہ آیت ۹۰)

لوگوں نے قرآن مجید کا مذاق بنا رکھا ہے۔ یہاں پر اگر قوالی ہوتی، مشاعرہ ہوتا یا کوئی فلم ہوتی تو آپ دیکھتے کہ لوگوں کے ٹھٹ کے ٹھٹ لگ جاتے، لیکن قرآن مجید کا بیان ہو، رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سُنّت، آپؐ کی حدیث یا آپؐ کی سیرت کا بیان ہو تو بس چند اللہ کے بندے آجاتے ہیں۔ یہ ہمارا حال ہے۔ اسی لئے قرآن مجید میں آتا ہے کہ قیامت کے دن حضورِ اکرمؐ اپنی اُمّت سے شکوہ کریں گے: وَقَالَ الرَّسُوْلُ یٰرَبِّ اِنَّ قَوْمِی اتَّخَذُوْا هٰذَا الْقُرْاٰنَ مَهْجُوْرًا ۝ (سورۃ فرقان، آیت ۳۰) "رسول کہے گا اے میرے پروردگار! میری قوم نے قرآن کو چھوڑ دیا تھا، اس پر عمل کرنا ترک کر دیا تھا۔ اب تو حالت یہاں تک پہنچ

گئی ہے کہ لوگ بچوں کو ناظرہ قرآن بھی نہیں پڑھاتے، حفظ کرانا تو بڑی بات ہے۔ لوگ سوچتے ہیں کون حفظ کرائے، حفظ کرانے میں چار سال لگیں گے۔ چار سال میں تو بچہ کہاں سے کہاں پہنچ جائے گا۔ میٹرک کرنے میں سولہ سال لگتے ہیں (یعنی سولہ سال کی عمر میں میٹرک پاس کرلیتا ہے) حفظ کرائیے تو بچہ میٹرک بیس سال میں جا کر کرے گا۔ ایک صاحب نے اخبار میں ایک مضمون لکھا تھا کہ مشرقی پاکستان میں جسے اب بنگلہ دیش کہا جاتا ہے، کچھ لوگوں نے تحقیق کی کہ کالجوں میں اخلاق و کردار کے لحاظ سے کون سے لڑکے اچھے ہوتے ہیں تو سروے کے بعد معلوم ہوا کہ جن لڑکوں نے بچپن میں قرآن مجید ناظرہ پڑھا تھا، کالج میں جانے کے بعد وہ اخلاق و کردار کے لحاظ سے ممتاز تھے۔ یہ قرآن مجید کی بڑی برکت ہے۔ اگر سمجھ کر پڑھا جائے تو یہ تو بڑی بات ہے لیکن اگر ناظرہ ہی پڑھ لیا جائے تو اس میں بھی برکت ہوتی ہے، اور انسان کا اپنے رب کے ساتھ کچھ نہ کچھ تعلق ہو جاتا ہے۔ یہ معاملہ اب گھٹتا جاتا ہے۔

پہلے بچے نہ صرف ناظرہ پڑھتے تھے، بلکہ حفظ کرتے تھے، انہیں اس کا شوق ہوتا تھا۔ اب وہ زمانہ لد گیا۔ اب نہ حفظ کا وہ چرچا ہے نہ پہلے جیسے قرآن مجید پڑھنے والے ہیں پہلے عورتیں تک قرآن مجید حفظ کرتی تھیں، وہ حافظہ ہوتی تھیں، ان میں باہم ایک دوسرے سے مقابلہ ہوتا تھا۔ اب مقابلہ اس کا نہیں ہوتا کہ اللہ کے دین کا کتنا علم حاصل کیا قرآن کتنا پڑھا۔ اب مقابلہ کھیلوں کا ہوتا ہے۔ قرآن مجید کے ساتھ ہمارا یہ سلوک نہایت افسوسناک ہے۔

قرآن مجید کے ساتھ ہمارا تعلق کیسے قائم ہو اور اس کو کس طرح ہم سمجھیں اس سلسلہ میں، میں نے ابتداء میں سورۃ العصر پڑھی تھی جو نمازوں میں اکثر پڑھی جاتی ہے۔ حالانکہ یہ دو سطروں میں لکھی جاتی ہے، لیکن اتنی جامع سورت ہے کہ گویا سمندر ہے جسے کوزے میں بند کر دیا گیا ہے۔ الفاظ تھوڑے ہیں لیکن معانی و مطالب بہت وسیع ہیں فرمایا: وَالْعَصْرِ ۝ قسم ہے زمانہ کی۔ اللہ تعالیٰ نے زمانہ کو بطور گواہ کے پیش کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ جب کوئی قسم بیان فرماتے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اُسے گواہ بناتے ہیں۔ یعنی بعد میں جس بات کو بیان کرنا ہوتا ہے اُس کے لئے پہلے اپنی مخلوق میں سے کسی کو گواہ بنا لیتے ہیں۔ یعنی جو بات آگے بیان کی جا رہی ہے، جو دعویٰ پیش کیا جا رہا ہے

اُس دعویٰ کی سچّائی اور صداقت پر زمانہ گواہ ہے۔ شروع سے لے کر اب تک کی تاریخ گواہ ہے، قوموں کی تاریخ پڑھ جائیے تو معلوم ہوگا کہ تمام انسان گھاٹے میں ہیں مگر وہ جنھوں نے چار اصول اپنائے، جنھوں نے چار باتوں پر عمل کیا وہ گھاٹے سے پاک ہو گئے۔ یہ گویا قرآن مجید کا دعویٰ ہے۔ عصر کے معنی عربی زبان میں نچوڑنے کے آتے ہیں۔ جیسکہ سورۃ یوسف میں فرمایا: اِنِّیْٓ اَرٰىنِیْٓ اَعْصِرُ خَمْرًا ۭ (آیت ۳۶) "میں دیکھ رہا ہوں کہ میں شراب نچوڑ رہا ہوں"۔ ع۔ ص۔ ر: عصر۔ اس کا معنیٰ نچوڑنا ہوا۔ اب جو عرق آپ نے نچوڑ لیا وہ واپس نہیں جا سکتا۔ اگر آپ لیموں کا عرق نچوڑ کر چاہیں کہ عرق پھر واپس لیموں میں چلا جائے تو یہ ناممکن ہے۔ سائنس نے اتنی ترقی کر لی ہے لیکن اب تک کوئی ایسی مشین ایجاد نہیں ہوئی جو گنّے سے نکلے ہوئے رس کو واپس گنّے میں ڈال دے اور گنّا پھر تازہ ہو جائے۔ گنّے کا رس گنّے میں واپس نہیں جا سکتا، لیموں کا عرق دوبارہ لیموں میں واپس نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح زمانہ ہے کہ جو گذر گیا واپس نہیں آسکتا۔

زمانہ کو عصر اسی لئے کہتے ہیں کہ زمانہ گویا نچوڑا ہوا رس ہے جو واپس نہیں آسکتا۔ اسی طرح بوڑھے آدمی کی جوانی واپس نہیں آسکتی۔ جو جوان ہیں اُن کا بچپن واپس نہیں آسکتا۔ جو گزر گیا، سو گزر گیا۔ کسی شاعر نے کیا خوب کہا ہے ؎

لَیْتَ الشَّبَابَ یَعُوْدُ یَوْمًا ——— فَاُخْبِرَهٗ بِمَا فَعَلَ الْمَشِیْبُ

کاش! کہ جوانی لوٹ آتی تو میں اُسے بتاتا کہ بڑھاپے نے مجھ پر کیا ستم ڈھائے ہیں، جھُرّیاں پڑ گئی ہیں، دانت ٹوٹ گئے ہیں، معدہ خراب ہو گیا ہے، کھانا ہضم نہیں ہوتا، بُری حالت ہو گئی ہے۔ مگر جوانی تو واپس نہیں آسکتی، وہ کیسے واپس آئے گی۔ تو معلوم ہوا کہ بچپن گیا واپس نہیں آسکتا، جوانی گئی واپس نہیں آسکتی، اُدھیڑ پن کی عمر گئی واپس نہیں آسکتی۔ ہاں بڑھاپا آگیا تو واپس نہیں جاتا۔

بڑھاپے کی بھی دو قسمیں ہیں۔ ایک بڑھاپا تو وہ ہے جب انسان چل پھر سکتا ہے اور دوسرا بڑھاپا وہ ہے جب وہ صاحبِ فراش ہو جاتا ہے کہ بس پلنگ پر پڑا ہوا ہے۔ خدا اس سے بچائے، تو یہ بڑھاپا بھی حقیقت میں خدا کی طرف سے آزمائش ہے۔ تو فرمایا والعصر "قسم ہے زمانہ کی!"۔ اِنَّ کا معنیٰ ہے بیشک۔ یہ تحقیق کے معنی میں آتا ہے۔ اَلْاِنْسَانَ۔ اَلْ

کے معنی یہاں یہ ہیں "تمام"۔ عربی میں ایک "ال" ایسے ہے جیسا کہ انگریزی میں لفظ THE ہے جو خاص کے معنی میں آتا ہے اور ایک "ال" انگریزی کے ALL کے معنی میں آتا ہے یعنی 'تمام'۔ تو یہاں یہ دوسرا 'ال' مراد ہے۔

زمانہ گواہ ہے بیشک تمام انسان گھاٹے میں ہیں، خسارے میں ہیں: اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا۔ مگر جو ایمان لے آئے۔ ایمان کے معنی یقین کے ہیں۔ یعنی اللہ تعالیٰ پہ ایمان، اُس کے رسولوں پہ ایمان، خاص کر رسولِ اکرمؐ پہ ایمان، آپؐ کی رسالت پر ایمان آپؐ کی نبوّت پہ ایمان، آپؐ کے خاتم النّبیین ہونے پر ایمان، جو کچھ بھی آپؐ لائے ہیں اور جو کچھ بھی آپؐ نے فرمایا ہے اُس پر ایمان، آپؐ کے سچے ہونے پر ایمان، آپؐ کے امانتدار ہونے پہ ایمان، آپؐ کے حیادار ہونے پر ایمان۔ غرضیکہ جتنے بھی اچھے اخلاق ہو سکتے ہیں اُن سب سے آپؐ موصوف تھے، اس بات پر ایمان۔ ایمان تین ہیں۔ اوّل اللہ تعالیٰ پہ ایمان، دُوُم رسولِ اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم کی جو صفات قرآنِ حکیم میں بیان ہوئی ہیں اور جو حدیث میں بیان ہوئی ہیں اُن پر ایمان اور سوُم آخرت پر ایمان۔ یہ تینوں ایمانیات بنیادی ہیں۔ اسی لئے آپؐ مکّی سورتوں میں دیکھیں گے کہ ایمان عقیدۂ توحید اور آخرت کا بہت بیان کیا گیا ہے۔ اس لئے کہ جب تک یہ پختہ نہ ہو، اس کے مطابق دل و دماغ کی اصلاح نہ ہو، اس وقت تک صحیح معنوں میں اچھا عمل ہو نہیں سکتا۔ عمل کی بنیاد ایمان ہے۔ اس کی مثال بالکل ایسے ہے کہ ایک انگارہ سامنے رکھا ہوا ہے۔ آپ کو یقین ہے کہ آگ جلاتی ہے۔ انگارے کو ہاتھ لگائیں گے تو ہاتھ جل جائے گا جھلس جائے گا۔ اس لئے آپ اس کی طرف ہاتھ نہیں بڑھاتے، لیکن ایک چھوٹا سا معصوم بچّہ ہے، اُسے پتہ نہیں یہ انگارہ کیا چیز ہے۔ اُس کے لئے تو وہ ایک چمکدار چیز کھلونے کی مانند ہے۔ وہ اسے اٹھانے کے لئے اپنا ہاتھ آگے بڑھائے گا۔ اگر آپ نہ روکیں گے تو وہ ہاتھ جلا بیٹھے گا۔ بس اس یقین کا نام ایمان ہے کہ آگ جلا دیتی ہے۔ اسی طرح جن کا ایمان دوزخ پر ہے وہ ایسے کام کیوں کریں گے جو دوزخ کی آگ میں لے جانے والے ہیں۔ جن کا ایمان نہیں ہے وہ ہر کام کر لیتے ہیں، اُنہیں جنّت و دوزخ کی پرواہ نہیں ہوتی، تو جزا و سزا پہ ایمان ہونے یا نہ ہونے کا فرق یہ ہے۔ اُن کا انجام وہی ہے جو کافروں اور منکرین کا انجام ہوتا ہے اور جو اس بچّہ کا انجام ہوتا ہے جو انگارہ پہ ہاتھ رکھ دیتا ہے اور اپنا ہاتھ جلا لیتا ہے۔ اس سے

فرمایا گیا ہے : اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا - مگر وہ جو ایمان لے آئے - بنیادی معاملہ عقیدۂ ایمان کا ہے - سب سے پہلے ایمان باللہ ہے - اللہ تعالیٰ پر ایمان، یعنی اللہ تبارک و تعالیٰ کی ذات پر ایمان، اُس کی ذات پر ایمان، اُس کے اختیارات پر ایمان، اُس کے جو حقوق ہیں اُن پر ایمان - یہی دراصل توحید ہے اور یہی معنی ہیں ایمان باللہ کے - اللہ تعالیٰ کی ذات پر ایمان کا مطلب یہ ہے کہ اُس کی ذات میں کوئی شریک نہیں ہے - اِلٰہٌ وَّاحِدٌ : اللہ ایک ہی ہے اُس کے ساتھ کسی اور کو الٰہ ماننا شرک ہوگا - اللہ تعالیٰ کی صفات پر ایمان جو توحید کی صفات کہلاتی ہیں - معنیٰ اس کے یہ ہیں کہ جو صفات اللہ تعالیٰ کے لئے خاص ہیں وہ بندوں میں نہیں مانی جا سکتیں - حتیٰ کہ انبیائے کرام اور اولیائے کرام میں نہیں مانی جا سکتیں۔ جو اللہ کی صفات ہیں وہ اُسی کے لئے خاص ہیں - مثلاً وہ حیّ و قیّوم ہے، وہ زندہ رہنے والا ہے، ہمیشہ سے ہے ہمیشہ رہے گا - یہ اللہ تعالیٰ کی صفت ہے جس میں کوئی شریک نہیں - سب کے لئے فنا ہے اُس کے لئے فنا نہیں ہے - لم یزل، لایزال - اللہ تعالیٰ کی ایک اور صفت قرآن مجید میں عالم الغیب والشّہادہ بیان ہوئی ہے - وہ کھلے اور چھپے کا جاننے والا ہے - یہ صفت کسی انسان، کسی نبی، کسی ولی کی نہیں ہو سکتی - کسی کو کچھ خبر نہیں کہ کل کیا ہونے والا ہے :

وَمَا تَدْرِیْ نَفْسٌ مَّاذَا تَكْسِبُ غَدًا ؕ وَمَا تَدْرِیْ نَفْسٌۢ بِاَیِّ اَرْضٍ تَمُوْتُ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلِیْمٌ خَبِیْرٌ ۝ (سورت لقمان آیت ۳۴)

کسی جان کو نہیں معلوم کہ کل اُس کے ساتھ کیا ہوگا اور اُسے نہیں معلوم کہ کل اُس کی موت کہاں آئے گی - بے شک اللہ تعالیٰ خبر رکھنے والا، جاننے والا ہے ! — حدیث میں آتا ہے کہ ایک شادی میں ایک لڑکی شعر پڑھ رہی تھی (چھوٹی بچیاں گیت گا رہی ہوں گی) رسولِ اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم بھی وہیں تشریف فرما تھے - بچّی نے یہ مصرعہ پڑھا : فینا نبیٌّ یعلم ما فی غدٍ : "کہ ہمارے درمیان ایسا نبی ہے جو جانتا ہے کہ کل کیا ہوگا !" رسولِ اکرم نے فرمایا کہ : "خبردار ! ایسا نہ کہو - یہ اللہ تعالیٰ کی شان ہے !" — اِنَّمَا الْغَیْبُ لِلّٰهِ ؕ (سورۂ یونس آیت ۲۰) "غیب کا علم اللہ تعالیٰ ہی کو ہے !" — وہی کھلے اور چھپے کا جاننے والا ہے، وہی قادرِ مطلق ہے - رحمٰن، رحیم، مالک، یہ اور اس طرح کی صفات اللہ تعالیٰ کی خاص صفات ہیں اور یہ صرف اُسی کے لئے خاص ہیں - اللہ تعالیٰ کے تمام بندوں میں محمّد رسول اللہ

کی شان سب سے اُونچی ہے۔ آپؐ سب سے افضل اور سب سے اعلیٰ ہیں۔ کوئی کتنا ہی متقی ہو، نیک ہو، زاہد ہو، عابد ہو، صوم و صلوٰۃ کا پابند ہو۔ پھر کوئی کتنی ہی عبادت کرے، ریاضت کرے، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے مرتبہ کو نہیں پہنچ سکتا۔ لیکن جو صفات خاص اللہ تعالیٰ کی ہیں وہ رسولِ اکرمؐ میں، کسی نبی میں، کسی ولی میں نہیں پائی جا سکتیں۔ اسی طرح پر ایک صفت اللہ تعالیٰ کی یہ ہے کہ وہ بخشنے والا ہے، وہ معاف کرنے والا ہے، وہ رحمٰن ہے، وہ رحیم ہے، اُس کی رحمت بے پایاں ہے۔ رحیم کا لفظ رسولِ اکرمؐ کے لئے بھی آیا ہے لیکن وہ اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی ہے، اللہ تعالیٰ کی رحمت لامحدود ہے، رسولِ اکرمؐ کی رحمت محدود ہے اس لئے اصل رحمت کی صفت اللہ تعالیٰ کی ہے۔ توحید کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ جو بندوں کی صفات ہیں، جو ان کی کمزوریاں ہیں وہ اللہ تعالیٰ کے لئے ثابت نہ کی جائیں۔ اگر آپ نے یہ ثابت کر دیا تو یہی شرک ہوگا۔ مثلاً باپ ہونا، بیٹا ہونا، شوہر ہونا، بیوی ہونا۔ یہ انسانوں میں ہوتا ہے، مخلوق میں ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ اس سے پاک ہے: لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُوْلَدْ وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ ۝ نہ وہ کسی کا بیٹا ہے، نہ کسی کا باپ ہے نہ کوئی اس کا ہمسر ہے۔ وہ سب سے بالاتر ہے (نہ اُس کی بیوی ہے، نہ اُس کے بچے ہیں!) معلوم ہوا کہ جو بندوں کی صفات ہیں وہ اللہ تعالیٰ کے لئے ثابت کرنا اصل توحید کے خلاف ہے۔ اسی طرح جو صفات خاص اللہ تعالیٰ کے لئے مخصوص ہیں وہ بندوں کے لئے ماننا، خواہ وہ کتنے ہی اونچے درجہ کے ہوں، یہ بھی توحید کے خلاف ہے۔ تو پہلا ایمان، ایمان باللہ ہے یعنی اُس کی ذات پر ایمان، اُس کی صفات پر ایمان، اُس کے اختیارات پر ایمان، اُس کے تحقیق پر ایمان کہ اللہ تعالیٰ کامل ہے، وہ رحیم ہے، خالق ہے، قادرِ مطلق ہے۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم قیامت کے دن شفاعت کریں گے۔ حدیث میں آتا ہے کہ قیامت کے دن لوگ پریشان ہوں گے، اُمتیں پریشان ہوں گی، اُمتِ محمدیہ بھی پریشان ہوگی۔ اس پریشانی کے عالم میں لوگ مختلف انبیائے کرام کے پاس جائیں گے۔ حضرت آدمؑ حضرت نوحؑ، حضرت ابراہیمؑ، حضرت موسیٰؑ، حضرت عیسیٰؑ، سب کے پاس جائیں گے سب یہی کہیں گے کہ ہم کچھ نہیں کر سکتے۔ تو سب کے سب رسولِ اکرمؐ کے پاس آئیں گے، اور کہیں گے کہ آپ ہماری شفاعت کیجئے تو آپؐ فرمائیں گے۔ اُمتی، اُمتی۔ ہاں میں سفارش کروں گا۔ حدیث میں آتا ہے کہ رسولِ اکرمؐ فرماتے ہیں کہ میں اپنے ربّ کے سامنے سجدہ میں

گر جاؤں گا اور طویل سجدہ کروں گا۔ اپنی اُمّت کو بخشوانے کے لئے اپنے رب سے التجائیں کروں گا، گنہگاروں کو بخشوانے کے لئے ان کی شفاعت کی دعائیں کروں گا، تو اللہ تعالےٰ فرمائیں گے: "یَا مُحَمَّدُ اِرْفَعْ مَا اَسَكَ سَلْ تُعْطَ وَاشْفَعْ تُشَفَّعْ۔ یا محمدؐ اپنا سر اُٹھائیے، اور مانگئے، آپ کو دیا جائے گا، اور شفاعت کیجئے آپؐ کی شفاعت قبول کی جائے گی۔ اے نبیؐ! آپ شفاعت کیجئے، آپؐ کی شفاعت قبول ہوگی۔ یہ ہے توحید۔ یہ نہیں کہ اللہ تعالیٰ کچھ فرما رہے ہیں، اور رسول اللہ کچھ کہہ رہے ہیں، اور رسول اللہ کا ارشاد اللہ تعالیٰ کے حکم پر غالب آجائے۔ یہ نہیں ہوسکتا بلکہ اللہ کا حکم ہر حال میں غالب رہے گا۔ قرآن مجید میں آتا ہے: "وَلَا يَشْفَعُوْنَ اِلَّا لِمَنِ ارْتَضٰى" (سورت انبیاء۔ آیت ۲۸): نہیں شفاعت کریں گے مگر اُن کے لئے جنھیں اللہ نے پسند کر لیا ہے، اور اُس کے اذن اور اُس کے حکم کے بغیر شفاعت نہیں کریں گے۔ یہ وہ حقیقت ہے جو قرآن مجید میں بیان ہوئی ہے — اگر قرآن مجید کو اس طرح سمجھا جائے تو اصل توحید صاف کھل کر آجاتی ہے۔

اللہ پر ایمان لانے کے بعد دوسرا ایمان کا درجہ ہے، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان۔ ہمیں قرآن مجید رسول اکرمؐ کے ذریعہ ملا ہے، کیونکہ آپؐ نے یہ بتایا کہ یہ قرآن اللہ کی کتاب ہے۔ جب تک کہ آپؐ کو سچّا نہیں مانیں گے اور آپؐ کی رسالت اور نبوّت پر ایمان نہیں لائیں گے ہماری نجات نہیں ہوسکتی۔ کوئی شخص کتنا ہی اللہ پر ایمان لے آئے لیکن اگر وہ رسول اکرمؐ کی رسالت پر، آپؐ کے پیغمبر ہونے پر، آپؐ کے سچّے نبی ہونے پر ایمان نہیں لاتا تو اللہ تعالیٰ کے ہاں اُس کی نجات نہیں ہوسکتی۔ اُسے کیسے خبر ہوئی کہ قرآن اللہ کی کتاب ہے۔ یہ تو رسول اکرمؐ نے فرمایا تب ہی معلوم ہوا، اور آپؐ کو رسول کیسے مانا۔ اس لئے کہ آپؐ سچّے تھے، امین تھے، مشرکوں، کافروں اور دشمنوں نے بھی اس کی گواہی دی۔ جب آپؐ نے نبوّت کا دعویٰ کیا ہے تو کسی نے یہ نہیں کہا کہ آپؐ جھوٹے ہیں، کافروں نے بھی یہ نہیں کہا کہ آپ جھوٹے ہیں۔ کیونکہ وہ جانتے تھے کہ آپؐ صادق اور امین ہیں:

فَقَدْ لَبِثْتُ فِيْكُمْ عُمُرًا مِّنْ قَبْلِهٖ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ۝ (سورۃ یونس آیت ۱۶)

کہ میں نے تمھارے اندر ایک لمبی مدّت گذاری ہے، پھر کیا تم عقل نہیں رکھتے!"

کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ چالیس برس تک اُس نے کبھی جھوٹ نہیں بولا، خیانت نہیں کی بے ایمانی نہیں کی اور چالیس برس ہونے کے بعد ہی جب کہ انسان زیادہ سنجیدہ ہو جاتا ہے اُس میں اتنی

جرأت آگئی کہ وہ اللہ پر جھوٹ باندھتا ہے اور کہتا ہے کہ مجھ پر وحی آئی ہے، یہ کیسے ممکن ہے؟ رسولِ اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم نے دلیل میں اپنی زندگی پیش کی کہ میں نے تم میں ایک لمبی مدّت گذاری ہے۔ پھر تم کیسی باتیں کرتے ہو؟ کیا تم میں عقل نہیں ہے؟ رسولِ اکرمؐ پر ایمان لانا اور آپؐ کی وہ صفات جو قرآن مجید میں بیان ہوئی ہیں اور صحیح احادیث میں بیان ہوئی ہیں کہ آپؐ مُبشّر ہیں، آپؐ مُنذر ہیں۔ آپؐ نذیر ہیں، آپؐ سراجِ مُنیر ہیں، آپؐ روشن چراغ ہیں، آپؐ روشن آفتاب ہیں۔ اِن تمام صفات پر ایمان لانا بھی ایمان کی ایک شاخ ہے، ایمان کا ایک حصّہ ہے۔ آپؐ کی ایک صفت خاتم النّبیین بھی ہے کہ رسولِ اکرمؐ آخری نبی ہیں۔ آپؐ کے بعد کوئی نبی نہیں آسکتا، خواہ وہ بروزی ہو، خواہ مستقل ہو، خواہ غیر مستقل۔ حضورؐ کی صفت خاتم النّبیین قرآن مجید میں اس طرح بیان ہوئی ہے: مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَا اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَ خَاتَمَ النَّبِيّٖنَ ۝ (سورۃ الاحزاب آیت ۴۱) "محمدؐ تم میں سے کسی مرد کے باپ نہیں ہیں لیکن وہ اللہ کے رسول اور خاتم النّبیین ہیں"۔ یعنی تمام نبیوں کو ختم کرنے والے ہیں، تمام نبیوں کی آمد پر مہر لگادی۔ اب آپ کے بعد یہ سلسلہ ختم ہوگیا، قیامت تک اب آپؐ کی نبوّت چلے گی۔ اب کوئی نبی نہیں آسکتا جو آپؐ کی نبوّت کو ختم کردے یا اپنی طرف سے کچھ اور لگائے یا آپ کا ظلّ اور بروز بن کر اپنا کاروبار چمکائے!

ایمان باللہ اور ایمان بالرّسالت کے بعد تیسرا ایمان بالآخرت ہے۔ آخرت پر ایمان کا مطلب یہ ہے کہ یہاں پر اگر ہم اچھّے کام کریں گے تو اُس کا بدلہ آخرت میں اچھّا ملے گا، اور اگر یہاں بُرے کام کریں گے تو آخرت میں بُرے بدلے سے ہمکنار ہوں گے۔ ایمان بالآخرت کے بغیر ہماری دُنیا نہیں سنور سکتی۔ ایمان لانے سے جنّت تو ملے گی، لیکن اگر لوگ آخرت پر صحیح معنوں میں ایمان لے آئیں تو دُنیا بھی ملے گی۔ اس کی ایک مثال یہ ہے کہ ایک دفعہ حضرت عمر فاروق رضؓ رات کو گھوم رہے تھے۔ یہ آپؓ کی عادت تھی۔ خلافت کی ذمّہ داریوں کی وجہ سے بے چین رہتے تھے۔ راتوں کو گھوم کر دیکھتے تھے کہ کوئی بھوکا تو نہیں سو رہا، کوئی یتیم تو نہیں رو رہا، کوئی بیوہ تو بے چین و بے قرار نہیں ہے۔ اپنا خادم ساتھ لیتے اور رات کو شہر کا گشت لگاتے تھے۔ چنانچہ اُس رات گھومتے گھومتے ایک گھر کے پاس سے گذرے۔ صبح کا وقت قریب تھا، اذان ہونے والی تھی، ایک بڑھیا اپنی بیٹی سے کہہ رہی تھی

بیٹی دودھ میں پانی ملا دو تاکہ زیادہ فائدہ ہو سکے۔ مثلاً چار سیر دودھ اگر ہو تو پانی ملا کر پانچ سیر ہو جائے، اور ایک سیر کے زیادہ پیسے ملیں گے۔ بیٹی سمجھدار تھی، اُس نے کہا کہ میں تو نہیں ملاتی۔ بڑھیا نے کہا کہ کون سا عمرؓ دیکھ رہا ہے، ملا دے نا! کیونکہ حضرت عمر فاروقؓ کا بڑا رعب داب تھا اور پھر اُن کے پاس کوڑا اور دُرّہ تھا۔ لڑکی نے جواب دیا: ہاں عمرؓ تو نہیں دیکھ رہا مگر عمرؓ کا خدا تو دیکھ رہا ہے۔ اللہ دیکھ رہا ہے عالم الغیب دیکھ رہا ہے، احکم الحاکمین دیکھ رہا ہے، ربّ العالمین دیکھ رہا ہے۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو لڑکی کا یہ جواب بہت پسند آیا۔ آپنے اپنے خادم سے کہا کہ اس گھر پہ نشان لگا دو، کل ہم اس گھر میں اپنے لڑکے کے لئے رشتے کا پیغام بھجوائیں گے۔ تو یہ تھی لڑکی جو حضرت عمر فاروقؓ کی بہو بنیں اور حضرت عمرؒ بن عبدالعزیز کی نانی ہوتی ہیں۔ یہ تھا اُس زمانہ میں لڑکی کے لئے نیکی کا معیار۔ آج معیار بدل چکے ہیں۔ آج لڑکی کا حُسن و جمال دیکھا جاتا ہے، تعلیم اور ڈگریاں دیکھی جاتی ہیں اور بڑے خاندان سے تعلق دیکھا جاتا ہے۔ ایمان بالآخرۃ آپکے اس دُنیا میں خالص دودھ اور گھی کے ملنے کا ذریعہ بن جاتا ہے۔

اگر گھی دودھ اور مصالح وغیرہ بیچنے والے آخرت پہ ایمان رکھتے ہوں تو ملاوٹ ختم ہو جائے، بے ایمانی ختم ہو جائے، ہر چیز خالص ملنے لگے، رشوت کا بازار ختم ہو۔ رشوت یہاں لوگ دیتے بھی ہیں، کھاتے بھی ہیں۔ یہ اس لئے کہ آخرت پہ ایمان نہیں ہے۔ ایمان بالغیب نہیں ہے، ایمان بالشہود ہے۔ ایمان بالشہود کے معنیٰ ہیں جو چیز سامنے ہے، نظر آ رہی ہے اُس پہ ایمان لاؤ۔ اگر کوئی شخص ہزار روپے رشوت دے رہا ہے تو یہ سامنے کی چیز ہے لے لی جائے گی، آخرت کی خبر خدا جانے، جب آئے گی دیکھا جائے گا، جہنم کا عذاب اور آگ کے شعلے تو دُور کی باتیں ہیں، اس وقت تو ہزار روپے مل رہے ہیں، انہیں لے کر مزے کرو۔ لیکن اگر آخرت پہ ایمان ہو تو یہ نہیں ہو سکتا۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "لعن اللہ الرّاشی والمرتشی والرّائش!" (لعنت ہے راشی پر یعنی رشوت دینے والے پر والمرتشی اور رشوت قبول کرنے والے پر اور جو ان دونوں کے درمیان دلالی کرتا ہے)۔ جو بڑے افسر ہوتے ہیں وہ خود رشوت نہیں لیتے اُن کے دلال اور ایجنٹ ہوتے ہیں، وہ کام کرا دیتے ہیں اور رشوت وصول کر کے افسر تک پہنچا دیتے ہیں۔ اس میں خود اُن کا

اپنا حصّہ بھی ہوتا ہے۔ اب اگر آخرت پر ایمان ہے تو پھر یہ دھندے نہیں چل سکتے۔ یکلخت سب ختم ہو جائیں گے۔ جیسا کہ حدیث میں آتا ہے کہ حضرت عبداللہ بن رواحہ یہودیوں کے پاس گئے تھے۔ یہودیوں کے ساتھ یہ معاہدہ ہو چکا تھا کہ باغ میں جو پھل آئیں گے اُس کا نصف وہ رکھیں گے اور نصف حصّہ مسلمانوں کا ہوگا۔ تو مسلمانوں کا نصف حصّہ وصول کرنے کے لئے وہ صحابیؓ پہنچے۔ یہودیوں نے انہیں رشوت دینی چاہی کہ وہ مسلمانوں کا حصّہ کم وصول کریں۔ مثلاً کھجوریں اگر حصّہ میں ساٹھ من آتی تھیں تو کہا ہوگا کہ چالیس من لے جاؤ بقیہ کے بدلے میں ہم سے کچھ رقم لے لو۔ آج کل کے لوگ ہوتے تو فوراً قبول کر لیتے۔ اپنا فائدہ دیکھتے چاہے مسلمانوں کا بیت المال بالکل خالی ہو جائے۔ تو انہوں نے کہا کہ نہیں ایسا کبھی نہیں ہو سکتا۔ انہوں نے ساری کھجوروں کے برابر برابر دو حصّے کر دیئے اور یہودیوں سے کہا کہ ایک حصّہ وہ لے لیں اور دوسرا حصّہ انہوں نے لاکر بیت المال میں جمع کرا دیا۔ دل میں اگر خوفِ آخرت ہو تو کوئی طمع انسان کو راہِ راست سے نہیں ہٹا سکتی۔ دُنیا میں اگر امن کا بول بالا ہو سکتا ہے، عدل و انصاف قائم ہو سکتا ہے، راحت حاصل ہو سکتی ہے تو اس کی ایک ہی شکل ہے کہ اللہ تعالیٰ پر اُس کی صفات کے ساتھ ایمان، رسولِ کریمؐ پر ایمان اور آخرت پر ایمان پختہ اور یقینی ہو۔ اگر یہ نہیں ہے تو پھر یہ دُنیا جہنّم ہے چاہے آپ کتنے ہی مارشل لاء لگا دیں، کتنے ہی کوڑے ماریں اور کچھ ہی کیوں نہ کر ڈالیں۔ اگر دل میں ایمان نہیں اُترا تو لوگ حیلے نکال لیتے ہیں۔

اب مثلاً حکومت کی طرف سے پابندی ہے کہ شادی بیاہ میں بیس سے زائد آدمیوں کو کھانا نہ کھلایا جائے۔ لیکن کل مَیں ایک شادی کی تقریب میں شریک ہوا تو وہاں تقریباً پانچ سو آدمی ہوں گے اور سب کو کھانا کھلایا جا رہا تھا۔ اب کیا یہ گیا کہ ولیمہ کی جگہ عقیقہ کر دیا گیا تھا ولیمہ لیکن ظاہر عقیقہ کیا گیا۔ اس لئے کہ ولیمہ میں افراد پر پابندی ہے جب کہ عقیقہ میں نہیں۔ ایمان دل میں نہ ہو تو قانون کی پابندی سے بچنے کے لئے سینکڑوں حیلے تراش لئے جاتے ہیں۔ حضرت عمر فاروقؓ کے زمانہ میں ایک بہت ہی نیک مجاہد فوجی تھا جس کے کپڑے پھٹے، پیوند لگے تھے اور کمبل بھی پرانا لپٹا ہوا تھا۔ اس کو کسریٰ کا تاج ملا۔ بہت ہی قیمتی، موتی ہیرے جواہرات سے مرصّع۔ وہ اسے اپنے پھٹے پرانے کمبل میں لپیٹے رات کی تاریکی میں لے کر اپنے سپہ سالار کے پاس آیا اور کہا کہ یہ تاج مجھے پڑا ملا ہے، آپ وصول کر لیجئے اور

مدینہ بھیج دیجئے، یہ مسلمانوں کا حق ہے، بیت المال میں جمع کرا دیجئے۔ اگر وہ چاہتا تو تاج کی کسی کو خبر نہ دیتا، پورا تاج ہضم کر جاتا یا اُس میں سے کچھ قیمتی موتی چُرا لیتا لیکن جیسا اُس کو ملا تھا ویسا ہی اُس نے حوالے کر دیا۔ اور کمال یہ ہے کہ رات کی تاریکی میں کمبل میں چھپا کر خاموشی سے لے گیا۔ وہ اس لئے کہ لوگ یہ نہ کہیں کہ بڑا ایماندار ہے۔ ہمارے ہاں لوگوں کا حال یہ ہے کہ ذرا سا سماجی کام اگر کر دیں تو اس کی نمائش کرتے پھریں گے۔ غریبوں کی مدد کرنے یا سیلاب زدگان کو کوئی عطیہ دینے جا رہے ہوں تو فوٹو گرافروں کو ساتھ لے جائیں گے۔ ذرا سا نیکی کا اگر کوئی کام کیا تو اُس کی شہرت ہو گئی۔ اخبار میں خبر شائع ہو گئی، کسی غریب کو کوئی عطیہ دیتے ہوئے فوٹو شائع ہو گیا کہ یہ ہیں وہ صاحب کہ جنھوں نے حاتم طائی کی قبر پہ لات ماری ہے۔ وہ جو کسی نے کہا (غالباً حضرت عمر فاروق رضؓ نے کہا تھا) کہ ہمارے مجاہد تو بڑے امانتدار ہیں انھیں کسریٰ کا تاج ملا اور فوراً سپہ سالار کے حوالے کر دیا تو جواب میں حضرت عمرؓ کے ساتھی ایک صحابی رضؓ نے کہا کہ بات یہ ہے عمرؓ! تم امانتدار ہو تو یہ بھی امانتدار ہیں۔ تم دیکھتے ہو کہ یہ جائز ہے، وہ ناجائز ہے، یہ حلال ہے وہ حرام ہے تو تمھاری رعایا بھی، تمھارے فوجی اور مجاہد بھی غلط کاموں سے بچے ہوئے ہیں اور جائز اور ناجائز، حلال و حرام کی تمیز روا رکھتے ہیں۔ جب ایسا ایمان ہو گا تو اس کا نتیجہ اور ثمرہ ہو گا "وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ"۔ اس کا پھل نیک عمل ہیں۔ یہ ناممکن ہے کہ ایمان دل میں ہو، خدا کا خوف دل میں ہو، اللہ تعالیٰ کی محبت دل میں ہو، اُس کے رسولؐ کی محبت دل میں ہو اور پھر عملِ صالح دل میں نہ ہو، یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ آدمی جھوٹ بھی بولتا ہے اور اللہ تعالیٰ اور اُس کے رسولؐ کی محبت کا دعویٰ بھی کرے۔ اِس کی مثال ایسے ہے کہ جیسے کسی کا بوڑھا باپ بیمار ہو، بیٹا کہتا ہے ابّا جان! مجھے آپ سے محبت ہے، شدید محبت ہے، مَیں آپ کی محبت میں مرا جا رہا ہوں، آپ کی بیماری دیکھ دیکھ کر مجھے بڑی تکلیف ہو رہی ہے، کاش! آپ کی جگہ مَیں ہوتا، مَیں آپ کی جگہ مر جاؤں اور آپ زندہ رہیں۔ آپ میرے بڑے محسن ہیں، بہت کرم فرما ہیں۔ مُنہ پہ بے حد تعریف کرتا ہے۔ باپ کہتا ہے بیٹے! مَیں اس وقت شدید تکلیف میں ہوں، تم ڈاکٹر کے پاس جا کر میرے لئے دوا لے آؤ۔ بیٹا کہتا ہے کہ تھوڑی دیر کے لئے صبر کیجئے، ایک بڑی شاندار فلم آ رہی ہے۔ مَیں ذرا اُسے دیکھ لوں اس کے بعد دوا لے آؤں گا۔ چاہے اتنے عرصے میں باپ قبرستان پہنچ جائے۔ تو ایسی

ہی ہماری محبت کا حال ہے۔ہم زبان سے کہتے تو ہیں کہ ہمیں اللہ اور اُس کے رسولؐ سے بڑی محبت ہے۔لیکن جب عمل کا وقت آتا ہے تو صاف طرح دے جاتے ہیں۔رسولِ اکرمؐ کا حال تو یہ تھا کہ نماز کے لئے مسجد میں تشریف لاتے تھے، بیماری کی حالت میں بھی مسجد آتے تھے اور جماعت سے نماز نہیں چھوٹنے تھے۔ دو آدمیوں کے کاندھوں پہ ہاتھ رکھ کر آپ کے قدم لکیر کھینچتے تھے اور ہمارا حال یہ ہے کہ ہم خرّاٹے لیتے رہتے ہیں اور اُس وقت سو کر اُٹھتے ہیں جب سورج طلوع ہو چکتا ہے اور پھر بھی کہتے ہیں کہ ہم اللہ اور اس کے رسولؐ کے بڑے چاہنے والے ہیں۔رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم کا پہلا حق یہ ہے کہ آپؐ سے محبت ہونی چاہیئے، آپ کی محبت دل میں گھر کر جائے۔حدیث میں آتا ہے : لا یومن احدکم حتی اکون أحبّ الیہ من والدہ وولدہ والنّاس اجمعین ۝ (کہ تم میں سے کوئی شخص اس وقت تک مومن نہیں ہوسکتا جب تک میں پیارا نہ ہو جاؤں تمھارے ماں باپ سے اور دنیا بھر کی مخلوق سے !)۔ دوسرا حق آپؐ کا یہ ہے کہ آپ کی محبّت کے ساتھ ساتھ آپؐ کی عظمت بھی ہو، آپ کی بڑائی ہو۔محبّت تو انسان اولاد سے بھی کرتا ہے، بیوی سے بھی کرتا ہے، دوستوں سے بھی کرتا ہے۔لیکن رسول اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم سے محبّت ایسی محبّت ہونی چاہیئے کہ جس کے ساتھ عظمت بھی ہو، بڑائی بھی ہو، تعظیم بھی ہو۔کیونکہ اگر تعظیم نہ ہو تو وہ محبّت بیکار ہے۔نبی اکرمؐ کا تیسرا حق ہے آپؐ کی اطاعت، آپؐ کا اتّباع اور آپؐ کی سُنّت کی پیروی۔آپ کہتے ہیں محبّت تو بہت ہے لیکن اطاعت نہیں، ہو رہی تو یہ کیسی محبّت ہے۔زبان سے تو آپ محبّت محبّت بہت کہیں لیکن اصل چیز ہے اطاعت، آپؐ کے احکام کی اور اس شریعت کی جسے لے کر آپؐ آئے ہیں۔اللہ تعالیٰ کے حکم سے جسے آپؐ نے حلال ٹھہرایا ہے اُسے حلال سمجھا جائے جسے حرام قرار دیا ہے اُسے حرام سمجھا جائے، جسے آپؐ نے پسند یا ناپسند کیا ہے، وہی ہماری بھی پسند یا ناپسند ہو۔جب تک ہم ایسا نہیں کریں گے اطاعت کیسے ہوگی اور محبّت کس چیز کا نام ہے اور تعظیم کسے کہتے ہیں۔قرآن مجید میں فرمایا :

"فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا ۝ (سورت نساء - آیت ۶۵)۔ (قسم ہے تیرے رب کی یہ لوگ ہرگز مومن نہیں ہوسکتے یہاں تک کہ آپؐ کو ان تمام معاملات میں حَکم اور جج نہ بنائیں جن میں جھگڑتے

ہیں اور آپؐ کے فیصلے کو سن کر کوئی تنگی محسوس نہ کریں۔ بلکہ خوشی خوشی اس فیصلے کو مان جائیں !)

مطلب یہ کہ آنکھیں بھی ٹھنڈی ہو جائیں اور دل بھی باغ باغ ہو جائے۔ اللہ اور اُس کے رسولؐ کے فیصلے کے آگے سرِ تسلیم خم کر دیں، چاہے اُس سے بظاہر کتنا ہی نقصان نظر آ رہا ہو۔ یہ مطلب ہے "اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ !" کا۔ "صالحات" کے سلسلے میں ایک بات اور سمجھ لیجئے کہ "الصّٰلحٰت" کے معنیٰ ہیں خاص قسم کی نیکیاں۔ اِس میں جو "ال" ہے اس کے معنیٰ وہی ہیں جو انگریزی میں THE کے ہوتے ہیں۔ THE BOOK کے معنیٰ خاص کتاب۔ "الصّٰلِحٰت" کے معنیٰ ہیں خاص نیکیاں۔ وہ نیکیاں جنھیں اللہ اور اُس کے رسولؐ نے نیکی قرار دیا ہے۔ کوئی مولوی صاحب، کوئی پیر صاحب یا کوئی حاکم کسی کام کو نیکی قرار دے دیں تو وہ نیکی نہیں بن سکتا، جب تک کہ اُس کے ساتھ اللہ اور اُس کے رسول کی شہادت موجود نہ ہو۔ اسی طرح کوئی اسمبلی کسی کام کو "نیکی" قرار دے دے تو وہ اُس وقت تک نیکی قرار نہیں دیا جا سکتا جب تک اللہ اور اُس کے رسولؐ کی سند اُس کے ساتھ نہ ہو۔ کتنی ہی بدعات مسلمانوں میں رائج ہیں جن کا کوئی ثبوت اللہ کی کتاب یا رسولِ اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم کی سُنّت اور حدیث سے نہیں ملتا۔ چنانچہ اُن کا شمار "الصّٰلحٰت" میں نہیں ہوگا، چاہے انہیں کتنا ہی ثواب کی نیّت سے کیا جائے۔ انسان کا عمل وہی قبول ہوگا جس میں اخلاص ہو، جو صرف اللہ کے لئے ہو، ساتھ ہی سُنّت کے مطابق ہو، رسولِ اکرمؐ کے ارشاد اور آپؐ کے فرمان کے مطابق ہو۔ ؛

جب آپ ایمان بھی لے آئے، نیک عمل بھی آپ نے کئے تو "ایمان اور عملِ صالح !" دونوں نعمتیں آپ کو مل گئیں۔ اب یہ نعمت آپ کی ذات تک محدود نہ رہے بلکہ متعدّی ہونی چاہیئے۔ آپ کے گھر والوں کی طرف، آپ کے پڑوسیوں میں، آپ کے رشتہ داروں میں، آپ کے دوستوں میں، جہاں تک ہو سکے یہ متعدّی ہو۔ جیسے بیماری متعدّی ہوتی ہے، برائی متعدّی ہوتی ہے، اِسی طرح نیکی بھی متعدّی ہوتی ہے۔ وہ آگے بڑھنی چاہیئے۔ ہم خود نیک ہیں اولاد نیک نہیں ہے، وہ نماز نہیں پڑھتی۔ یہ نیکی متعدّی کہاں ہوئی، یہ تو ایک جگہ پر ٹھیر گئی۔ "وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ !" وہ آپس میں وصیّت کرتے ہیں حق کے ساتھ۔ یعنی نیکی کو پھیلایا جائے۔ لیکن نیکی کو پھیلانے سے قبل ہمیں اُس کا شعور ہونا چاہیئے کہ نیکی کیا ہے اور بدی کیا۔ پھر وصیّت

(بقیہ صفحہ ۷۹)

درسِ حدیث

ایمان و عمل کی سلامتی اور دو مسنون دُعائیں

از قلم : مولانا محمد حسین میر، اُستاذ عربی ، قرآن اکیڈمی

حدیث ۱ : عَنْ ابی موسیٰؓ قال، قال رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم مثل القلب کریشۃ بارض فلاۃ یقلبھا الریاح ظھرًا لبطن (رواہ احمد)

حدیث ۲ : عَنْ انسؓ قال کان رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم یکثر ان یقول یامقلّب القلوب ثبت قلبی علیٰ دینک فقلت یا نبی اللہ اٰمنّا بک وبما جئت بہٖ فھل تخاف علینا قال نعم ان القلوب بین اصبعین من اصابع اللہ یقلبھا کیف یشاء (رواہ الترمذی وابن ماجۃ)

حدیث ۳ : عن عبد اللہ بن عمروؓ قال قال رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم : ان قلوب بنی اٰدم کلھا بین اصبعین من اصابع الرحمٰن کقلب واحد یصرفہ کیف یشاء ثم قال رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم : اللّٰھم مصرف القلوب صرف قلوبنا علیٰ طاعتک (رواہ مسلم)

❁ ترجمہ ۱ : ”حضرت ابوموسیٰ رضؓ سے مروی ہے وہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا : دل کی مثال پرندے کے اُس پر کی سی ہے جو بیاباں میں پڑا ہو کہ اسے آندھیاں نیچے اوپر کرتی رہتی ہیں !“

❁ ترجمہ ۲ : ”حضرت انس رضؓ سے مروی ہے وہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم اکثر یہ دعا مانگا کرتے تھے : اے دلوں کے الٹنے پلٹنے والے ! میرے دل کو اپنے دین پر جمائے رکھیو ! — اس پر میں نے عرض کیا : اے اللہ کے نبی ! ہم آپ پر اور آپ کی لائی ہوئی تعلیمات پہ ایمان لا چکے ، تو کیا آپ کو ہمارے بارے میں کوئی ڈر ہے ؟ آپؐ نے فرمایا : ہاں ! دل ، اللہ تعالیٰ کی انگلیوں کے درمیان ہیں ، وہ انہیں جیسے چاہے اُلٹ پُلٹ دیتا ہے !“

❁ ترجمہ ۳ : حضرت عبد اللہ بن عمروؓ سے مروی ہے ، وہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم نے ارشاد فرمایا : تمام انسانوں کے دل ایک دل کی طرح اللہ تعالیٰ کی دو انگلیوں میں ہیں ، وہ انہیں

جیسے چاہے گردش دیتا رہتا ہے۔ پھر آپؐ نے یہ دُعا کی : اے دلوں کو گردش دینے والے خدا! ہمارے دلوں کو اپنی اطاعت و فرماں برداری پر ہی گردش دیجو!"

انسان محض گوشت پوست کے ایک ڈھانچے کا نام نہیں بلکہ وہ عبارت ہے فکر و کردار کے اس تانے بانے سے جسے وہ اپنے اردگرد بنتا ہے۔ تعمیرِ شخصیت کے اس خمیر میں اگرچہ کردار و عمل کا ایک نمایاں مقام ہے، بلکہ کسی معاشرہ کی تشکیل یا اس کے استحکام میں اصل اہمیت ہی کردار و عمل کو حاصل ہے۔ تاہم اس حقیقت سے بھی انکار ممکن نہیں کہ کسی انسان کی سیرت کا مرکز و محور اس کا فکر ہی ہوتا ہے۔ یوں سمجھئے کہ فکر و ذہن ایک بنیاد ہے اور سیرت و کردار اس پر اٹھنے والی ایک عمارت۔ اگر یہ بنیاد مضبوط و مستحکم ہے تو اس عمارت کے بھی مضبوط و مستحکم ہونے کا امکان ہے۔ لیکن اگر خدانخواستہ یہ بنیاد ہی کمزور اور بودی ہو تو خطرہ ہے کہ سے "خشتِ اوّل چوں نہد معمار کج :: تا ثریا می رود دیوار کج!"

ایک طرف انسانی شخصیت کی تعمیر میں فکر کو یہ بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ دوسری طرف اُس کی کمزوری یا ہر لحظہ تغیّر پذیری کا یہ عالم ہے کہ اُس کے تحفّظ کا آپ لاکھ اہتمام کریں کسی وقت بھی کوئی اندرونی لہر اُٹھ کر اُس کے اندر تلاطم بپا کر سکتی اور پوری شخصیت کو تہ و بالا کر کے رکھ دے سکتی ہے۔ اسی برِّصغیر کے ایک نامور عالم و خطیب اپنے متعلق لکھتے ہیں کہ میرے والد ایک راسخ العقیدہ صاحبِ سلسلہ تھے۔ انہوں نے میرے خیالات کو اپنے کھینچے ہوئے حصار کے اندر بند رکھنے کے لئے اس قدر اہتمام کیا کہ مجھے دینی تعلیم کے لئے کسی دینی درسگاہ میں بھیجنا بھی گوارا نہ کیا، بلکہ گھر پر ہی میری تعلیم کا بندوبست کیا اور خوب ٹھونک بجا کر ایک قدامت پسند عالم کو میری تعلیم پر لگایا۔ ان سارے اہتمامات کے باوجود نہ معلوم کس گوشے اور کس رخنے سے میرے ذہن و فکر میں ایسا انقلاب آیا کہ میں نے ساری خاندانی روایات کو تج دیا۔ اسی طرح کی بیسیوں مثالیں ہمیں اپنے اردگرد مل جائیں گی کہ بعض اچھے خاصے دیندار گھرانوں میں پرورش پانے والے نوجوان خدا و رسول سے باغی ہو گئے اور دوسری طرف الحاد و زندقہ کے ماحول میں پروان چڑھنے والے لوگوں کی ایسی کایا پلٹی کہ وہ زاہدِ شب زندہ دار بن گئے۔ انسانی ذہن کی اسی کمزوری کو پرندے کے پر سے تشبیہ دی گئی ہے۔ ظاہر ہے کہ پرندے کا پر اپنی ذات میں بالکل کمزور اور بودا ہوتا ہے ❊

مذکورہ بالا مثالیں بتاتی ہیں کہ ہدایت وضلالت، راست روی و کج روی کے درمیان بہت کم فاصلہ ہے۔ خیال کی ایک ہی لہر ہمیں گمراہ سے ہدایت یافتہ اور ہدایت یافتہ سے گمراہ بنا دے سکتی ہے۔ ہمارے فکروخیال کی یہ تیز رو گاڑی ذرا سا کانٹا بدل جانے سے جہاں ہمیں اس لائن پہ بھی ڈال سکتی ہے جس کے متعلق کہا گیا ہے کہ: وَاللّٰہُ عَلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ! وہاں ہمیں اس راہ پر بھی سرپٹ لے جا سکتی ہے۔ جس کا انجام یہ ہو کہ: فانھاربہ فی نار جھنّم ط۔ گویا انسانی فکر اپنی ذاتی سوچ کے لحاظ سے بھی ہر وقت کسی نہ کسی انقلاب کی زد میں ہے۔ ذہن کی اسی کیفیت کو قرآن مجید نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے کہ: واعلموا انّ اللّٰہ یحول بین المرء وقلبہ۔

یہ تو وہ اندرونی خطرہ ہے جو ہمارے دین و ایمان کو اندرونی دشمنوں اور آستین کے سانپوں (نفس و شیطان) سے ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ اس سے کہیں زیادہ مہلک خطرہ ان بیرونی عوامل کا ہے جو ہر وقت انسان کے ذہن پر اثر انداز ہوتے رہتے ہیں۔ یہ اخبارات، یہ جرائد و رسائل، یہ ریڈیو، یہ ٹیلیویژن، یہ شعروادب، یہ آرٹ جو پوری طرح شیطانی قوّتوں کے تصرّف میں ہیں، اثر آفرینی میں ان کی قیامت سامانیوں کا اندازہ لگائیے اور پھر یہ بھی دیکھئے کہ کس طرح شب و روز ان کو انسانی ذہن کی تطہیر کے لئے استعمال کیا جا رہا ہے۔ اس پہ مُستزاد یہ کہ علمِ نفسیات نے انسانی ذہن پہ حملہ آور ہونے کے لئے ایسے خفیہ ہتھیار ان کو مہیّا کر دیئے ہیں کہ ان کے ہاتھوں گھائل ہونے والا خود بے ساختہ پکار اُٹھتا ہے کہ: لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں!

یہی وہ قوّتیں ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے: اَلْوَسْوَاسِ الْخَنَّاسِ الَّذِیْ یُوَسْوِسُ فِیْ صُدُوْرِ النَّاسِ ۝ کے الفاظ سے تعبیر کیا ہے۔ یعنی وہ لوگ جو غیر محسوس طریقے پر انسانوں کے ذہنوں میں وسوسے ڈالتے ہیں۔ الحاد و زندقہ اور فسق و فجور کے انہی لشکروں کو حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم نے "الرّیاح" کے ساتھ تشبیہ دی ہے۔ یہ آندھیاں جب اُٹھتی ہیں تو بیاباں میں پڑے ایک پَر کی طرح فکرِ انسانی اِدھر سے اُدھر اور اُدھر سے اِدھر جھکڑوں میں ہچکولے کھاتا پھرتا ہے اور اسے کسی دیوار یا درخت کا سہارا بھی میسّر نہیں آتا۔ جب مغرب سے سیاہ آندھیاں اٹھتی ہیں تو وہ اُسے ایک رُخ پہ اُڑا لے جاتی ہیں اور مشرق سے سُرخ بگولے اُبھرتے ہیں تو وہ اُسے دوسرے رُخ میں بہا لے جاتے ہیں۔

جب ذہنِ انسانی پر اندرونی و بیرونی دشمنوں کی یلغار ہو، ایسے میں صرف اللہ تعالیٰ ہی کی ذات ہے جس کی نصرت و اعانت پر بھروسہ کیا جا سکتا ہے، جس کے قبضۂ قدرت میں ہمارے دل بھی ہیں (بین اصبعین من اصابع اللہ) اور جسے اسباب و عوامل پر بھی ہر طرح کی قدرت حاصل ہے۔ اسی لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان احادیث کے اندر دُعا کی صورت میں، اس سے ایمان و عمل کی سلامتی کے لئے التجا کرتے رہنے کی تلقین کی ہے، اور یہی مُدّعا و مقصود ہے اِس دُعا کا جو قرآن مجید میں آئی ہے اور جسے اکثر حضورؐ مانگا کرتے تھے: رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا بَعْدَ اِذْ هَدَيْتَنَا وَهَبْ لَنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً ۚ اِنَّكَ اَنْتَ الْوَهَّابُ ۝

دونوں دعاؤں کے الفاظ میں کچھ اختلاف ہے اور وہ بڑا بلیغ و ذو معنیٰ اختلاف ہے۔ پہلی دُعا کے الفاظ ہیں: اے دلوں کے الٹنے پلٹنے والے! میرے دل کو اپنے دین پر جمائے رکھیو!۔ قلب اُلٹنے، کسی چیز کو سیدھے سے اُلٹے یا اُلٹے سے سیدھے رُخ پر کر دینے کو کہتے ہیں۔ دین چونکہ ایک فکر، ایک فلسفہ اور ایک نظامِ حیات ہے اور اُس کی ضد کُفر ہے، چاہے اُس کی نوعیت کوئی ہو کیونکہ: "الکفر ملّۃ واحدۃ"! تو دُعا کا مفہوم یہ ہوا کہ اے اللہ! میرے دل کے رُخ کو سیدھی جانب — دین اسلام کی جانب رکھیو! اِس کو اُلٹ کر کسی دوسرے دین، کسی دوسرے فکر یا کسی دوسرے فلسفہ پر نہ جما دیجو! — جب کہ دوسری دُعا کے الفاظ ہیں: اے دلوں کو گردش دینے والے! ہمارے دلوں کو اپنی اطاعت و فرماں برداری پر گردش دیجو! تصریف کا مطلب کسی چیز کو اُلٹا سیدھا، دائیں بائیں، نیچے اوپر گردش دینا ہے۔ چونکہ طاعت و فرمانبرداری کا تعلق عمل سے ہے اور عمل میں ہزار تنوّع ہے، صبح سے لے کر شام تک، گھر سے لے کر بازار، کھیت، دفتر یا کارخانے تک ہر روز سینکڑوں ایسے معاملات پیش آتے ہیں، جہاں انسان کے جذبات میں بہہ کر غلط عمل اختیار کر لینے کے امکانات ہوتے ہیں۔ اس لئے اللہ تعالیٰ سے دُعا کی جانی چاہیئے کہ وہ ہمارے دلوں کو اس عمل کی طرف پھیر دے جو اس کی اطاعت و فرمانبرداری کا حامل ہو، نہ کہ اُس کی نافرمانی و سرکشی کا۔ اس طرح یہ دونوں دُعائیں مل کر فکر و کردار یا ایمان و عمل کی سلامتی کی دعائیں بن جاتی ہیں۔ اَللّٰهُمَّ اَرِنَا الْحَقَّ حَقًّا وَّارْزُقْنَا اتِّبَاعَهٗ وَاَرِنَا الْبَاطِلَ بَاطِلًا وَّارْزُقْنَا اجْتِنَابَهٗ ط

بیداریٔ ضمیر کے نمونے

حافظ منظور احمد، ایم - اے
لیکچرار شعبۂ علوم اسلامیہ، زرعی یونیورسٹی، فیصل آباد

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کی آمد سے دُنیا ایک نئے تمدّن اور طرزِ معاشرت سے رُوشناس ہوئی، جس کا پہلے کوئی تصوّر موجود نہیں تھا۔ اہلِ دُنیا کو عظمتِ انسان کا درس دیا گیا اور مختلف طبقات اور متنفّر طبائع کو کچھ اس طرح قریب لایا گیا کہ وہ ایک ہی کنبہ کے افراد نظر آنے لگے۔ الدّنیا مزرعة الاٰخرة فرما کر دُنیا اور اُس کی رعنائیوں سے پردہ اُٹھایا گیا اور جو جو لغزشیں دُنیا اور اُس کے مظاہر کو سمجھنے میں سرزد ہوئی تھیں۔ ایک ایک کر کے اُن کی نشاندہی کی گئی۔ انسان کے ضمیر کو بیدار اور اُس کے شعور کو زیادہ سے زیادہ حسّاس بنایا گیا۔ یہ اسی روحانی انقلاب کا نتیجہ تھا کہ جزیرۂ عرب کے مٹھی بھر انسانوں نے نہایت ہی مختصر مدّت میں دُنیا کی دو عظیم سلطنتوں پر غلبہ حاصل کیا۔ یہ رُوحانی عظمت ہمیں حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے صبر میں بھی نظر آتی ہے، جس کا مظاہرہ انہوں نے قریش کی ایذا رسانی کا سامنا کرتے ہوئے کیا۔ قریش نے حضرت بلالؓ کو دینِ حق سے پھیرنے کے لئے ایسی جفائیں روا رکھیں، جن کی برداشت انسان کی ہمّت سے باہر ہے۔ اُنہیں تپتے سنگریزوں پر لٹایا جاتا اور بھاری بھاری پتھر اُن کے سینے پر رکھے جاتے۔ لیکن ان ناقابلِ برداشت مصائب پر بھی وہ اَحَد اَحَد کہا کرتے تھے۔ یہ وہ دینی روح تھی، جو کسی راہ چلتے عامی میں سرایت کرتی تو وہ شاہانِ کج کلاہ کے سامنے کھری کھری باتیں کرتا اور راہِ حق میں کسی قسم کی ملامت تک کی پرواہ نہ کرتا۔ یہی انقلابی روح خلیفۂ ثانی میں نظر آتا ہے، جو وسیع سلطنت کا مالک ہونے کے باوجود سادگی قناعت اور بے نیازی کے اعلیٰ معیار پر قائم رہے۔ ایسے ہی بیداریٔ ضمیر کے صدہا واقعات ہیں جن سے تاریخِ اسلام بھری پڑی ہے۔ افادۂ عام کے لئے چند ایک واقعات پیشِ خدمت ہیں:

بُریدہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ انہوں نے کہا: "ماعز بن مالک رسول اللہ کی خدمت

میں حاضر ہوئے اور کہا اے اللہ کے رسول! مجھے پاک کر دیجئے۔ آپؐ نے فرمایا "تیرا بُرا ہو، جا اور اللہ کے حضور توبہ واستغفار کرلے!"۔ راوی کہتا ہے، وہ تھوڑی دور تک گئے، پھر واپس لوٹ آئے اور آپ سے پھر کہا کہ "اے اللہ کے رسول! مجھے پاک کر دیجئے!" رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم نے پھر وہی جواب دیا۔ تین بار ایسا ہی ہوا۔ چوتھی بار رسول اللہؐ نے فرمایا: "میں تجھے کس چیز سے پاک کروں؟ وہ بولے "زنا سے!"۔ رسول اللہؐ نے لوگوں سے پوچھا: "یہ شخص پاگل تو نہیں ہے؟ آپؐ کو بتایا گیا کہ وہ پاگل نہیں ہے!۔ آپؐ نے دریافت کیا: کیا اُس نے شراب پی ہے؟ ایک شخص نے اُٹھ کر ماعز کی بُو سونگھی تو اسے شراب کی بُو نہیں ملی۔ آپؐ نے پھر اُس سے پوچھا: "کیا تم نے زنا کیا ہے!"۔ انہوں نے کہا: "ہاں" اس پر آپؐ نے حکم صادر فرمایا اور انہیں سنگسار کر دیا گیا۔ اس واقعے کو دو تین دن گزرے ہوں گے کہ رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم تشریف لائے اور فرمایا "ماعز" کے لئے مغفرت کی دُعا کرو۔ اُس نے ایسی توبہ کی ہے کہ اگر اسے پوری قوم کے درمیان تقسیم کر دیا جائے تو وہ ان کے لئے کافی ہے۔

پھر آپؐ کے پاس قبیلۂ ازد کے بطنِ غامد کی ایک عورت آئی اور اس نے کہا: "اے اللہ کے رسولؐ! مجھے پاک کر دیجئے۔ آپ نے فرمایا: تیرا بُرا ہو، جا اور اللہ کے حضور توبہ کر!"۔ وہ بولی: "کیا آپؐ مجھے ماعز کی طرح واپس لوٹانا چاہتے ہیں۔ یہ زنا سے قرار پایا ہوا حمل ہے!" آپ نے فرمایا: "کیا تو زنا سے حاملہ ہے؟"۔ اُس نے کہا "ہاں"۔ آپؐ نے فرمایا: "وضعِ حمل تک انتظار کرو!"۔ راوی کہتا ہے کہ پھر آپؐ نے اُس عورت کو بچّہ جننے کے عرصہ کے لئے ایک انصاری کی نگرانی میں دے دیا۔ کچھ عرصہ کے بعد انصاری نے حضورِ اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم کو مطلع کیا کہ غامدی عورت بچّہ جن چکی ہے۔ آپؐ نے فرمایا: "ہم ایسا نہیں کریں گے کہ اُسے سنگسار کر دیں اور اُس کے شیرخوار بچّے کو اکیلا چھوڑ دیں کہ اسے کوئی دودھ پلانے والا نہ ہو!"۔ اِس پر ایک انصاری نے کھڑے ہو کر کہا: "اے اللہ کے نبی! دودھ پلانے کا انتظام میرے ذمّہ ہے!"۔ راوی کہتا ہے کہ حضورؐ نے اُسے سنگسار کرا دیا۔ ایک دوسری روایت میں ہے کہ آپؐ نے فرمایا لوٹ جا۔ بچّہ جننے کے بعد آنا۔ جب وہ آئی تو آپؐ نے فرمایا: "جا اِسے دودھ پلا، دودھ چھڑانے کے بعد حاضر ہونا!"۔ چنانچہ جب آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوئی تو بچّے کے ہاتھ میں روٹی کا ٹکڑا تھا۔ آپؐ نے بچّہ کسی مسلمان کے سپرد کیا اور اُس عورت

کے رجم کا حکم دیا گیا۔ خالد بن ولید نے آگے بڑھ کر ایک پتھر اس کے سر پر مارا، جس سے اڑ کر خون کے کچھ چھینٹے آپ کے چہرے پر پڑے۔ اس پر آپ نے اُسے بُرے الفاظ سے یاد کیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: خالد! ذرا سنبھل کر۔ اُس ذات کی قسم جس کے قبضے میں میری جان ہے، اس عورت نے ایسی توبہ کی ہے جو اگر ناجائز چنگی وصول کرنے والا بھی کرتا تو اسے بخش دیا جاتا۔

ماعزؓ اور اس عورت کا کردار ہمارے سامنے ہے۔ اس میں شک کی گنجائش نہیں ہے۔ کسے پتہ نہیں ہوگا کہ اسے کتنے بُرے انجام سے دوچار ہونا پڑے گا۔ انہیں کسی نے جرم کرتے ہوئے دیکھا نہیں تھا کہ ان کا جرم ثابت کیا جاسکتا۔ آپ کی شفقت اور رحمت کا یہ تقاضا تھا کہ شبہ کی بنا پر ان کو سزا سے معاف رکھیں۔ لیکن ان دونوں نے بہت اصرار کیا اور بچ نکلنے کے تمام دروازے اپنے اوپر بند کر لئے۔ آخر یہ سب کیوں؟ ان کا یہ کہنا کہ اے اللہ کے رسول! مجھے پاک کر دیجئے۔ ان کے اندر ایک ایسی محرک قوت کے وجود کی نشاندہی کرتا ہے جو خود زندہ رہنے کی خواہش پر بھی غالب ہے۔ یہ قوت ضمیر کی بیداری اور ضمیر کا شعور ہے۔ یہ گناہ سے پاک ہونے کی طلب ہے جس سے سوائے اللہ تعالیٰ کے اور کوئی واقف نہیں ہے۔ یہ اس بات سے آنے والی شرم ہے کہ کل اللہ تعالیٰ کے حضور میں حاضر ہونا ہے کہ ایک گناہ کیا تھا جس سے ابھی تک پاک نہیں ہو سکے۔ یہ ہے حقیقی اسلام۔ یہ ہے شدتِ احساس جو مجرم کے ضمیر میں جنم لیتا ہے۔

اس سلسلے میں شام کی امارت سے حضرت خالد بن ولیدؓ کو معزول کر کے ابوعبیدہؓ کو امیر مقرر کرنے کا واقعہ ہے۔ یہ حضرت خالدؓ بھی جو ابھی تک کسی شکست سے دوچار نہیں ہوئے۔ وہ ایسے سپاہی تھے جن کی رگ وپے میں شجاعت سرایت کئے ہوئے تھی۔ جاہلیت میں بھی اور اسلام میں بھی۔ انہیں امارت سے معزول کیا جاتا ہے۔ مگر یہ کینہ وفساد پر نہیں اترتے۔ انہیں غیرت نہیں ستاتی کہ میدانِ جنگ سے روپوش ہو جائیں۔ کسی طرح کی بغاوت کا خیال دل میں آنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ سابقہ جوش وجذبہ اور اللہ تعالیٰ کے دین کے غلبہ کے لئے پوری تڑپ اور خدا کے راستے میں شہید ہونے کی تمنا کے ساتھ مصروفِ پیکار رہے۔ دراصل اسلام فرد کے ذہن میں جو ہمہ وقتی بیداری اور اس کے احساس میں جو شدت پیدا کرتا ہے وہ ان تمام خیالات سے بلند ہے۔ اور دیکھئے خلیفۃ المسلمین عمر بن الخطاب پانی کا مشکیزہ اٹھائے چلے آرہے ہیں۔ ان کے صاحب زادے ناپسندیدگی کے لہجے میں ان سے پوچھتے ہیں۔ آپ نے ایسا کیوں

کیا۔ آپ جواب دیتے ہیں: "میرا نفس غرور و خود پسندی میں مبتلا ہوگیا تھا۔ میں نے چاہا کہ اسے ذلیل کروں!"۔ بیداریٔ احساس ملاحظہ ہو۔ اس شخص کے دل کے کسی گوشہ میں خلافت فتوحات اور آئندہ آنے والی عزّ و عظمت پر تھوڑی سی خود پسندی سوار ہوئی تو انہیں گوارا نہیں کہ یہ خود پسندی باقی رہے اور پروان چڑھے۔ وہ جھٹ نفس کو ذلیل کرنے اٹھ کھڑے ہوئے اور وہ بھی سب کے سامنے۔ اسے اس بات کی پرواہ نہیں کہ وہ اتنی وسیع سرزمین کا مالک ہے۔ اور یہ ہیں جناب علی رضؓ۔ جاڑوں کا زمانہ ہے۔ ٹھنڈک کے مارے تھر تھر کانپ رہے ہیں بدن پر گرمی کے کپڑے ہیں۔ اس کے علاوہ بچاؤ کے لئے کچھ نہیں۔ بیت المال ان کے ہاتھ میں ہے لیکن ضمیر کی بیداری اور شعور کی بلندی انہیں بیت المال سے استفادہ کرنے نہیں دیتی۔

عمواس میں ابو عبیدہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ اپنی فوج کے ساتھ پڑاؤ ڈالے ہوئے ہیں۔ عمواس کو ایک مہلک وبا نے اپنی لپیٹ میں لے رکھا ہے۔ حضرت عمرؓ کو ڈر ہے کہ امین الملت کو کوئی نقصان نہ پہنچے۔ چنانچہ انہیں اس وبا سے نکالنے کے لئے خط لکھ کر بلاتے ہیں: "امّا بعد! مجھے تم سے ایک ضروری کام کے سلسلے میں بالمشافہ گفتگو کی ضرورت محسوس ہو رہی ہے۔ تاکید کرتا ہوں کہ اس خط پڑھنے کے بعد اسے رکھنے سے پہلے ہی چل پڑنا!"۔ حضرت ابو عبیدہؓ حضرت عمرؓ کا خط پڑھتے ہی آپ کا مقصد بھانپ لیتے ہیں کہ انہوں نے مجھے اس مہلک وبا سے نکالنے کے لئے ایک بہانہ تلاش کیا ہے۔ فرماتے ہیں: "اللہ تعالیٰ امیر المؤمنین کو معاف رکھے۔ میں سمجھ گیا کہ آپ کو میری ضرورت کیا ہے۔ اس وقت میرے ساتھ مسلمانوں کا پورا لشکر موجود ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ اس سے جدا ہوں۔ میں انہیں اس وقت تک نہیں چھوڑوں گا جب تک اللہ تعالیٰ میرا اور ان کی تقدیر کا لکھا ہوا پورا نہیں کر دیتا۔ امیر المومنین! ان وجوہات کی بنا پر آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ آپ مجھے اس درخواست سے بری فرمائیں اور لشکر میں رہنے دیں!"۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ یہ خط پڑھ کر رونے لگے۔ حاضرین دریافت کرتے ہیں کہ ابو عبیدہؓ چل بسے۔ وہ آنسوؤں میں رندھی ہوئی آواز میں جواب دیتے ہیں: "گویا کہ چل بسے!"

یہ تقدیر الٰہی پر گہرا ایمان ہی تو تھا جس نے ابو عبیدہؓ کو موت کے منہ میں روکے رکھا۔ اور یہ احساس بھی کہ خود بھاگ جانا اور لشکرِ اسلام کو موت کے مُنہ میں چھوڑ دینا کسی طرح مناسب نہیں جب کہ سب اللہ تعالیٰ کی راہ کے سپاہی ہیں۔

امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا کردار ملاحظہ ہو۔ انہوں نے کچھ سامان اپنے شریک حفص

بن عبدالرحمٰن کے پاس بھیجا اور انہیں مطلع کر دیا کہ ان میں کچھ کپڑا عیب دار ہے۔ حفص نے یہ مال بیچ دیا مگر عیب بتانا بھول گیا۔ ناقص کپڑے کے عوض پورے دام وصول کر لئے۔ روایت ہے کہ اس کے دام تیس ہزار یا پینتیس ہزار تھے۔ امام ابوحنیفہ رح نے اپنے ساتھی کو لکھا کہ خریدار کی تلاش کرو۔ لیکن جستجو کے باوجود خریدار کا پتہ نہ چلا۔ اس پر ابوحنیفہ رح نے اپنے ساتھی سے علیحدگی اختیار کر لی۔ بلکہ اس قیمت کو اپنے پاکیزہ مال میں شامل کرنا بھی گوارا نہ کیا اور کل کا کل خیرات کر دیا۔ روایت ہے کہ یونس بن عبید کے پاس مختلف داموں کے کپڑے تھے۔ ایک قسم تھی جس کے جوڑے کے دام چار سو درہم تھے اور دوسری قسم کے جوڑے کے دام دو سو درہم تھے۔ آپ نماز کے لئے گئے اور اپنے بھتیجے کو دکان پر چھوڑ گئے۔ اسی اثناء میں ایک اعرابی آیا اور اس نے چار سو کی قیمت کا ایک جوڑا مانگا۔ لڑکے نے اسے دو سو درہم کا دکھایا اور اسے بہت پسند آیا اور وہ اسے راضی خوشی خرید کر چلا۔ وہ ہاتھ میں کپڑا لئے جا رہا تھا کہ راستے میں یونس بن عبید سے ملاقات ہو گئی۔ انہوں نے اعرابی سے دریافت کیا کہ آپ نے یہ کپڑا کتنے میں خریدا ہے۔ اس نے جواب دیا چار سو میں۔ انہوں نے فرمایا: "یہ دو سو سے زیادہ کا نہیں ہے۔ لوٹ جاؤ اور اسے واپس کر دو۔ اس نے جواب دیا۔ یہ جوڑا ہمارے علاقے میں پانچ سو کا ملتا ہے اور میں نے یہ راضی خوشی خریدا ہے۔ یونس نے کہا واپس جاؤ کیونکہ دین کی راہ میں خیر خواہی دنیا کی دولت سے بہتر ہے۔ پھر انہوں نے اپنے بھتیجے کو ڈانٹ پلائی اور کہا: "تجھے شرم نہ آئی، تجھے خدا کا خوف نہ آیا!" لڑکا قسم کھانے لگا کہ اس نے راضی خوشی خریدا ہے۔ اس پر آپ نے فرمایا: "جو تو اپنے لئے پسند کرتا ہے، دوسروں کے لئے کیوں پسند نہیں کرتا!"

محمد ابن منکدر سے مروی ہے کہ ان کی غیر موجودگی میں اُن کے ملازم نے ایک اعرابی کے ہاں پانچ پانچ درہم والے کپڑے کے ٹکڑے دس دس درہم میں بیچ دیئے۔ آپ کو معلوم ہوا تو اس اعرابی کی تلاش میں نکلے یہاں تک کہ اسے ڈھونڈ پایا اور اسے ملازم کی غلطی بتائی کہ اس نے پانچ درہم کے بدلے دس درہم کو بیچ ڈالا۔ مگر وہ تعجب سے بولا کہ میں نے یہ دام راضی خوشی دیئے ہیں۔ انہوں نے جواب دیا: "تم راضی ہو تو ہم تمہارے لئے وہ پسند کریں گے جو اپنے لئے پسند کرتے ہیں!"

بے شک ان تمام واقعات کے پیچھے کام کرنے والی ایک قوت ہے یعنی اپنے ضمیر کے آگے شرمانا اور خدا سے ڈرنا ہے۔ جب نفسِ انسانی اسلامی سیرت اختیار کر لیتا ہے تو روح

اسلام ہی میں سرایت کر جاتی ہے۔ یہ ضمیر کی بیداری اور احترام انسان کا درس ہی تھا جس نے فرضی انسانی تفریق کو ختم کیا۔ آپ کے زمانے میں غلام آزاد انسانوں سے الگ طبقہ — جانے جاتے تھے۔

اس سلسلے میں جب ہم محمدؐ بن عبد اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کا جائزہ لیتے ہیں تو ہمیں نظر آتا ہے کہ آپ اپنی پھوپھی زاد بہن زینب بنت جحش جو قریش کے ہاشمی خاندان سے تعلق رکھتی ہے، کی شادی اپنے آزاد کردہ غلام زید کے ساتھ کر دیتے ہیں۔ شادی ایک نازک مسئلہ ہے جس میں برابری کا سوال سب سے زیادہ ہوتا ہے۔ لیکن دین کی قوّت کے سوا کسی اور میں یہ طاقت نہیں کہ یہ معجزہ کر دکھائے۔ اس میں شک نہیں کہ ممالکِ متّحدہ امریکہ میں غلامی قانوناً ممنوع ہے لیکن کسی نیگرو کے لئے کسی سفید چمڑی کی عورت کے ساتھ خواہ وہ کتنی ہی گئی گذری کیوں نہ ہو شادی کرنا ممنوع ہے۔ یہی نہیں بلکہ سیاہ فام لوگوں کے لئے بسوں اور دوسری سواریوں میں گوروں کے ساتھ بیٹھنا، ان کے ریستورانوں میں جانا بالکل ممنوع ہے۔

زمانہ کی گاڑی آگے چلتی ہے اور خلیفۃ المؤمنین عمر بن الخطابؓ عمّار بن یاسرؓ کو کوفہ کا والی مقرّر کرتے ہیں حالانکہ وہ موالی میں سے ہیں۔ پھر ہمیں یہ نظر آتا ہے کہ عمرؓ کے دروازے پر عمرو بن حارث بن ہشّام کے بیٹے سہیل، ابوسفیان ابن حرب اور چند دوسرے اکابر قریش باریابی کے منتظر نظر آتے ہیں۔ لیکن آپ دو غریب موالی حضرت صہیب رضؓ اور حضرت بلال رضؓ کو سب سے پہلے بلاتے ہیں۔ کیونکہ وہ حضورؐ کے صحابہؓ اور جنگِ بدر کے شرکاء میں سے ہیں۔ اس تقدیم پر ابوسفیانؓ کے نتھنے غصّے سے پھول جاتے ہیں اور اُن کے منہ سے یہ جاہلیّت کی بات آتی ہے: "ایسی بات میں نے کبھی نہیں دیکھی کہ ان غلاموں کو اندر بلایا جائے اور ہمیں دروازے پر چھوڑ دیا جائے!"

موالی میں سے کسی نے قریش کے ایک فرد کو اس کی بہن کے رشتے کا پیغام دیا مگر قرشی نے انکار کر دیا۔ جب اس بات کا علم حضرت عمرؓ کو ہوا تو آپ نے اس سے پوچھا کہ نکاح میں مانع کیا ہے۔ وہ اچھّا آدمی ہے اور تیری بہن کو عطیہ بھی کافی فراخدلی سے دے رہا ہے۔ قرشی نے کہا کہ ہم اعلیٰ حسب ونسب والے لوگ ہیں۔ یہ شخص میری بہن کا کفو نہیں۔ اس پر حضرت عمرؓ نے فرمایا: "یہ آدمی دُنیا اور آخرت دونوں کا حسب رکھتا ہے۔ دُنیا کا حسب مال ہے اور آخرت کا حسب تقویٰ ہے۔ اگر عورت راضی ہے تو اس سے نکاح کر دیا جائے۔ چنانچہ انہوں نے اپنی بہن کا نکاح اُن سے کر دیا۔ خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را!"

ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کے ساتھ

بھارت میں پندرہ دن

از قلم :- قاضی عبدالقادر (کراچی)

بی آر بی نہر پیچھے نکل چکی تھی اور ہماری گاڑی تیز رفتاری کے ساتھ واہگہ کی جانب بڑھ رہی تھی۔ ڈرائیونگ سیٹ پر امیرِ محترم جناب ڈاکٹر اسرار احمد صاحب تشریف فرما تھے۔ یہ ڈاکٹر صاحب کی سوزوکی وین تھی، جس میں میرے اور اُن کے علاوہ میاں عارف رشید (ڈاکٹر صاحب کے صاحبزادے) میری اہلیہ اور چھوٹی بچی اور میرے ایک قریبی عزیز صابری صاحب بیٹھے تھے۔ آج اتوار تھا اور فروری کی تین تاریخ۔ مطلع صاف تھا اور موسم خوشگوار، حالانکہ کل ہی لاہور کو تیز اور سرد ہواؤں نے اپنی لپیٹ میں لیا ہوا تھا۔

یہ ہمارا انڈیا کا سفر تھا، جس کی تیاریاں خاصے عرصہ سے کی جا رہی تھیں۔ میری بہن اور بہنوئی علی گڈھ میں اور چھوٹا بھائی کانپور میں تھے، جن سے ملاقات کئے سترہ سال کی طویل مدّت گذر چکی تھی۔ ایک لکیر نے ہماری قربت کو طویل فاصلہ میں تبدیل کر دیا تھا۔ زمینی فاصلے دُور تھے لیکن دل بہت قریب تھے، کتنے ہی خاندان ہیں جنھیں ایک لکیر نے ایک دوسرے سے جدا کر دیا ہے۔ ۱۹۶۵ء اور ۱۹۷۱ء کی جنگوں نے عرصے عرصے تک انڈیا جانا ناممکن بنا دیا تھا۔ اس کے بعد ویزے ملنے شروع ہوئے تو اسلام آباد کے بھارتی سفارتخانے سے ویزا کا ملنا جُوئے شیر لانے سے کم نہ تھا۔ مہاجرین کی بڑی تعداد جو کراچی اور سندھ میں بستی تھی، ویزا کے حصول کے لئے اسلام آباد کا چکّر لگاتی، جس میں ضیاع ہوتا پیسے اور وقت کا اور حاصل ہوتی سخت ذہنی کوفت۔ جنتا گورنمنٹ کے زمانہ میں جہاں انڈیا اور پاکستان کے تعلّقات میں بہتری کی طرف پیش رفت ہوئی، وہیں یہ بھی ہوا کہ کراچی میں انڈیا کا ویزا آفس کھُل گیا اور ویزا کے حصول میں آسانیاں پیدا کر دی گئیں۔ چنانچہ اب کئی ماہ سے توحال یہ ہے کہ بیرونِ کراچی کے درخواست دہندگان کو اسی روز اور کراچی کے شہریوں کو دوسرے دن

ویزا مل جاتا ہے۔ اِس کے برخلاف ہمارے ہندوستانی بھائیوں کو دہلی کے پاکستانی سفارتخانہ سے ویزا حاصل کرنے میں نہایت مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ بار بار دہلی کے چکّر، روپے اور وقت کا ضیاع، انکوائریاں اور مہینوں کے بعد ویزا کا حصول، بقول اقبال ؎

"دیکھ مسجد میں شکستِ رشتۂ تسبیحِ شیخ ٭ بتکدے میں برہمن کی پختہ زُنّاری بھی دیکھ"

دہلی کے پاکستانی سفارتخانہ کے عملہ کے برتاؤ، ویزا اجازی کرنے میں لیت ولعل اور مہینوں تک چکّر لگوانے کے بعد ویزا کے اجراء نے بھارت میں پاکستان کے IMAGE کو سخت نقصان پہنچایا ہے۔ وہاں کے دوستوں نے ہمیں کہا کہ پاکستانی ارباب بست و کُشاد کو اس جانب توجہ دلائی جائے۔ اگر یہی سلسلہ جاری رہا تو پاکستان کی GOOD-WILL ختم ہوتی چلی جائے گی۔ پچھلے دَور میں تو بعض وجوہات سے یہ چیزیں قابلِ فہم تھیں، لیکن اب جنرل ضیاء الحق صاحب کے دَور میں اس کا کوئی جواز نہیں ٭

ہزاروں لاکھوں پاکستانیوں نے اپنے بچھڑے ہوئے بھارتی احباب سے ملاقات کے لئے جب بھارت جانا شروع کیا تو مَیں نے بھی نومبر ۱۹۷۹ء میں اپنا، اپنی اہلیہ کا ویزا حاصل کر لیا۔ ویزا کی مدّت تین ماہ کی تھی۔ ڈاکٹر صاحب سے جب مَیں نے ذکر کیا اور اُن سے بھی ساتھ چلنے کی خواہش کا اظہار کیا تو وہ بھی تیار ہو گئے۔ ڈاکٹر صاحب کی جائے پیدائش مشرقی پنجاب کا شہر حصار تھی جو دہلی سے کوئی اسّی میل دُور ہے۔ ۱۹۴۷ء کے ہنگاموں میں ڈاکٹر صاحب مع خاندان کے پیدل قافلہ کے ساتھ خون کا دریا پار کر کے حصار سے پاکستان تشریف لے آئے اور اس وقت سے کبھی دوبارہ بھارت جانے کا اتّفاق نہیں ہوا۔ بھارت میں اُن کا کوئی قریبی عزیز بھی نہیں رہا۔ حصار تو مسلمانوں سے بالکل ہی خالی ہو گیا۔ مشرقی پنجاب کے دیگر اضلاع میں اب کہیں کہیں مسلمان دوبارہ بسنے شروع ہو گئے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کے دل میں بھارت جانے اور وہاں کے شہروں خصُوصاً حصار جانے کی خواہش تو عرصہ سے ضرور تھی۔ اب جب مَیں نے اپنے ساتھ چلنے کی درخواست کی تو ڈاکٹر صاحب فوراً تیّار ہو گئے۔ پاسپورٹ تو موجود ہی تھا، ویزا حاصل کر لیا گیا۔ جنوری میں بھارت میں عام انتخابات ہونے والے تھے۔ اس سے قبل انتخابی ہنگاموں کا دَور ہوتا ہے۔ دسمبر اور جنوری شدید سردی کا زمانہ ہوتا ہے، اس لئے روانگی کے لئے فروری کا پہلا ہفتہ منتخب کیا گیا ٭

نہ جانے کیوں بچپن ہی سے سفر میرے لئے تفریح کا باعث ہوتا ہے۔ اگر

یہ مسافروں کی بھیڑ بھاڑ وغیرہ نہ ہو تو سفر واقعی میرے لئے ایک تفریح ہے۔ نئے نئے مقامات دیکھنے اور سیر سپاٹے کا شوق بچپن ہی سے گھٹی میں پڑا ہوا ہے۔ میری پیدائش یوپی کے ضلع بلند شہر کے ایک مشہور قصبہ ڈبائی کی ہے۔ علی گڑھ، ڈبائی سے کوئی پچیس میل دور ہے۔ بچپن میں اکثر میں ڈبائی سے علی گڑھ کا سفر کیا کرتا تھا۔ علی گڈھ کے کھٹ پُلے (شہر کے اندر ریلوے لائن کے اوپر پیدل چلنے کے لئے پل) پہ کھڑے ہو کر گھنٹوں ریلوں کی آمد و رفت کا نظارہ کرنا میرا محبوب مشغلہ تھا۔ مجھے یاد ہے، غالباً میں چوتھی کلاس میں تھا۔ اُردو کے ٹیچر جوہری صاحب نے مضمون لکھنے کو دیا تھا کہ "میں بڑا ہو کر کیا بنوں گا!" لڑکے مضمون لکھ کر لائے، اکثر نے ڈاکٹر اور انجینئر لکھا۔ آپ سُن کر تعجب کریں گے اور اُس وقت ہمارے ماسٹر صاحب کو بھی تعجب ہوا کہ میں نے لکھا کہ بڑا ہو کر میں ریل کا گارڈ بنوں گا، تاکہ نئے نئے شہر اور مقامات دیکھنے اور سفر، مسلسل سفر کا موقع ملتا رہے۔ یہ تھی سفر کے ساتھ بچپن سے میری دلچسپی۔ مجھے یاد ہے کہ بچپن میں سب سے لمبا سفر میں نے بینا (سی۔ پی) کا کیا تھا جہاں میرے ماموں پولیس انسپکٹر کی حیثیت سے تعینات تھے۔ یا پھر ۱۹۴۷ء میں پاکستان آنے کے لئے علی گڈھ سے بمبئی تک کا ریل کا اور بمبئی سے کراچی تا کا بحری جہاز کا سفر۔ اور یہ کراچی اور لاہور کے درمیان سفر تو اب روزمرّہ کے معمولات میں شامل ہو گیا ہے۔ ہم جب مسلمان ہیں تو ظاہر ہے کہ ہماری ہر چیز کو مسلمان ہونا چاہیئے۔ ہمارا حضر، ہمارا سفر سب اسلام کے تابع ہونے چاہئیں۔ ایک مسلمان کی زندگی کا جو مقصد ہے اور جسے ہم نے اپنی زندگی کا مقصد بنایا ہے اور جس کے لئے ہم جیتے ہیں سفر ہو یا حضر اُس سے غافل رہنے کا سوال ہی نہیں۔ صرف "تفریح" ہمارے لئے کچھ نہیں۔ ہم جب ایک نصب العین کے داعی ہیں تو ہماری "تفریح" بھی بامقصد ہونی چاہیئے۔ ہم جس مشن کو لے کر چل رہے ہیں اٹھتے بیٹھتے، چلتے پھرتے، سوتے جاگتے، ہر وقت اور ہر دم اس کا پیش نظر رہنا ہماری نجات اُخروی کے لئے ضروری ہے۔ چنانچہ انڈیا کا یہ سفر صرف تفریح کے لئے یا رشتہ داروں سے ملاقات کے لئے ہی نہیں تھا بلکہ اس کا مقصد یہ بھی تھا: ع "میرا پیغام محبت ہے جہاں تک پہنچے"! کسٹم کی پابندیوں کی وجہ سے زیادہ سامان نہیں لے جایا جا سکتا تھا۔ اس لئے ڈاکٹر صاحب کے کتابچوں کے چند سیٹ وغیرہ ہی پر اکتفا کرنا پڑا اور یوں ہمارے اس سفر کا آغاز ہوا۔ ڈاکٹر صاحب کے صاحبزادے میاں عارف رشید اور میرے ایک محترم عزیز

صابری صاحب واہگہ تک ہمیں چھوڑنے آئے - صابری صاحب کسٹم کے سپرنٹنڈنٹ ہیں، پہلے واہگہ پر تعینات تھے، آج کل بڑے ڈاکخانہ میں ہیں ؛

دوپہر کے بارہ بجے کے قریب ہم واہگہ بارڈر پر تھے - کسٹم وغیرہ کے مراحل سے جلد ہی فارغ ہوگئے - کسٹم سپرنٹنڈنٹ صاحب نے چائے وغیرہ سے ہماری تواضع کی - صابری صاحب نے ہمیں وہاں مسجد دکھائی جو حال ہی میں تعمیر کی گئی ہے، چھوٹی سی مسجد ہے مگر ہے خوبصورت! اس میں بچوں کے لئے ایک مدرسہ اور بچیوں کے لئے ایک انڈسٹریل ہوم کی بھی گنجائش رکھی گئی ہے - انڈسٹریل ہوم کے لئے کچھ مشینیں بھی آچکی ہیں - اللہ تعالیٰ نے صابری صاحب کو ایک دردمند دل دیا ہے - وہ سماجی کاموں میں بھی بڑھ چڑھ کر حصّہ لیتے رہتے ہیں - دُعا ہے کہ اللہ تعالیٰ انہیں اپنے دین کا سپاہی بنائے اور دین کی زیادہ سے زیادہ خدمت کی توفیق عطا فرمائے ؛

واہگہ کے گیٹ پر پاکستانی نوجوان رائفل لئے کھڑا تھا - چند قدم کے بعد بھارتی گیٹ پر رائفل بردار سردار جی کھڑے تھے - مَیں نے فوراً گھڑی دیکھی - بارہ بجنے والے تھے - مَیں ماضی کے جھروکوں میں جھانک کر کچھ سوچ ہی رہا تھا کہ سردار جی (قلی) نے کہا بابو جی! گھڑی آدھ گھنٹہ آگے کر لیجئے، یعنی ساڑھے بارہ بجے، اور میرے ذہن میں ایک لطیفہ گدگدی کرنے لگا - سرحد پر انڈیا اور پاکستان کے گیٹ آمنے سامنے ہیں، درمیان میں چند قدم کا فاصلہ ہے اور یہ جگہ "NO MAN'S LAND" کہلاتی ہے - دونوں گیٹوں پر دونوں ملکوں کے جھنڈے لہراتے رہتے ہیں - جو دو الگ الگ ملکوں کے مذہب، ثقافت، تمدّن اور تہذیب کی نمائندگی کرتے ہیں - سرحد سے پاکستان کی جانب واہگہ ہے، اور بھارت کی جانب پہلا قصبہ اٹاری - واہگہ کسٹم سے پاکستانی قلی سامان لاکر "NO MAN'S LAND" پر کھینچی ایک سفید لکیر پر رکھ دیتے ہیں - وہاں سے ہندوستانی قلی سامان اٹھاتے ہیں اور بھارت کی پہلی چوکی اٹاری تک لاتے ہیں - اٹاری پر بھی کسٹم وغیرہ کے مراحل سے جلد ہی فراغت ہوگئی - دونوں طرف قلیوں کے ریٹ متعین ہیں اور خاصا کنٹرول معلوم ہوتا ہے

۱۹۴۷ء میں پاکستان بننے کے بعد میں تو ۱۹۶۰ء اور ۱۹۶۳ء میں دو دو بار بھارت کا چکّر لگا چکا تھا اور وہاں پر ہندوؤں اور خصوصاً سکھوں کے مسلمانوں کے ساتھ تعلّقات میں جو تبدیلی آچکی تھی، اُس کا مشاہدہ کر چکا تھا - حالانکہ ۱۹۴۷ء میں بھارت

کے تمام اور خصوصاً مغربی علاقوں میں ہندو اور خصوصاً سکھ مسلمانوں کے جانی دشمن بن چکے تھے اور اُن کے خون سے ہولی کھیل رہے تھے۔ پہلی بار جب میں بھارت گیا تو بھارتی علاقے میں داخل ہونے کے بعد سکھوں کے مزاج میں خوشگوار تبدیلی محسوس کر کے خوشی ہوئی۔ کیونکہ لاشعور میں کہیں ایک سردار جی کرپان لئے بیٹھے تھے۔

ڈاکٹر صاحب ۱۹۴۷ء کے خونی فسادات کے بعد پہلی بار بھارت جا رہے تھے ظاہر ہے کہ ان کی کیفیت بھی کچھ اسی طرح کی ہوگی۔ واہگہ جاتے ہوئے راستہ میں غالباً ایک طویل سوچ کے بعد مجھ سے فرمایا: "کیا وہاں ریلوے کمپارٹمنٹ میں بھی سکھ بیٹھے ہوں گے!" اور میں اُن کی کیفیت کو بھانپ کر زیرِ لب مسکرا دیا۔۔۔ اور اب یہ اٹاری ہے اور ہم ہیں اور سکھوں کا دیس ہے۔ ڈاکٹر صاحب چاروں طرف سکھوں کو دیکھ دیکھ کر محظوظ ہو رہے تھے کیونکہ اب تو: ع جدھر دیکھتا ہوں اُدھر سکھ ہی سکھ ہیں!"۔۔۔ فرمانے لگے یہاں تو ایک دو نہیں پورے ہول سیل میں ہیں۔ امرتسر جانے کے لئے اٹاری پر ایک سردار جی کی ٹیکسی پکڑی، گاڑی کیا تھی کھٹارہ تھی، کبھی گاڑی رہی ہوگی

گیٹ کسی صورت بند نہیں ہوتا تھا۔ سردار جی نے ایک رسّی نکالی جو اسی کام کے لئے مخصوص تھی، اور دونوں دروازوں کو اس سے باندھ دیا، اور پھر ان دروازوں کو گھور کر یوں دیکھا جیسے کہہ رہے ہوں کہ اب کھل کے دیکھ نہ کردوں کرپان سے دو ٹکڑے تو خالصہ نام نہیں۔ ایسے میں ذہن میں سردار جی کے متعلق چند لطیفے بھی آ گئے، مگر سچی بات تو یہ ہے کہ سردار جی کے سامنے ڈاکٹر صاحب کو سنانے کی کچھ ہمت نہ پڑی، میری طبعی کمزوری آڑے آ گئی۔ ویسے بھی یہ سردار جی اور لطیفہ کا معاملہ تھا، کسی سلطانِ جابر کے سامنے کلمۂ حق کہنے کا معاملہ تو نہ تھا۔ سردار جی نے دروازوں کو رسّی سے باندھ کر مونچھوں پر یوں ہاتھ پھیرا جیسے کوئی بڑا معرکہ سر کیا ہو۔ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ کر جب انجن اسٹارٹ کیا اور گاڑی چلی تو جان میں جان آئی۔ معلوم ہوا کہ یہ گاڑی چلتی بھی ہے، کیونکہ بزرگوں سے سنا ہے کہ: "چلتی کا نام گاڑی ہے!"۔۔۔ ہاں یہ اندیشہ ضرور تھا کہ کہیں راستہ ہی میں "قیلولہ" نہ کرنے لگے یا "غفرلہٗ" نہ ہو جائے اور ہم دیارِ غیر میں بیکار ہو کر رہ جائیں۔

سردار جی کچھ زیادہ ہی ہنس مکھ تھے، ادھر ڈاکٹر صاحب کی طبیعت بھی سکھوں کے معاملے میں کھل چکی تھی۔ یعنی "انشراحِ صدر" حاصل ہو چکا تھا۔ راستہ بھر کبھی پنجابی اور کبھی اُردو میں باتیں ہوتی رہیں۔ اپنے پلّے کچھ پڑیں کچھ نہ پڑیں۔ نصف گھنٹہ کے بعد ہم امرتسر کی

حدود میں داخل ہو چکے تھے۔ خالصہ کالج کی عظیم عمارت کے سامنے سے گذرتے ہوئے میں نے ڈاکٹر صاحب سے پوچھ ہی لیا کہ لاہور میں اس کا ہوسٹل بننے کی نوبت آئی تھی یا نہیں اور ڈاکٹر صاحب ہلکے سے مسکرا دیئے۔ اور میں اُس مسجد کو کبھی نہ بھولوں گا جو اٹاری سے روانہ ہونے کے بعد تھوڑے ہی فاصلہ پر سڑک سے ہٹی ہوئی بائیں ہاتھ کو پڑتی ہے۔ دُور سے اس کی ویرانی دیکھ کر خیال ہوتا تھا جیسے برسوں سے کوئی یہاں نماز پڑھنے نہیں آیا۔ اس کی ویرانی میرے دل کی ویرانی کو چھیدے دے رہی تھی۔ جی چاہا کہ ٹیکسی رکوا کر دو رکعت نماز نفل وہاں ادا کر لوں، مگر خیالات کی رفتار ٹیکسی کی رفتار کا ساتھ نہ دے سکی۔ ٹیکسی آگے نکل چکی تھی، اُس کے مینار زبانِ حال سے پکار پکار کہہ رہے تھے کہ ؎

"کون سی وادی میں ہے، کون سی منزل میں ہے ❊ عشقِ بلا خیز کا قافلۂ سخت جاں!"

دل کے نہاں خانہ میں ایک لہر سی اُٹھی، ایک بجلی سی چمکی ؎

"غلغلوں سے جس کے لذّت گیر اب تک گوشِ نے ❊ کیا وہ تکبیر اب ہمیشہ کے لئے خاموش ہے!"

تیزی سے پیچھے گذرتے ہوئے میناروں کو دیکھ دیکھ کر دل تڑپ اٹھا ؎

"دیدۂ انجم میں ہے تری زمیں، آسماں ❊ آہ کہ صدیوں سے ہے تری فضا بے اذاں!"

ہوا کا ایک جھونکا آیا اور مجھے ایسا لگا جیسے ؎

"بُوئے یمن آج بھی اس کی ہواؤں میں ہے ❊ رنگِ حجاز آج بھی اُس کی نواؤں میں ہے!"

دل کی حالت کچھ عجیب سی تھی، آنکھوں سے اشک رواں تھے۔ ہائے! ہم حسرتیں اور خواہشیں تو لئے پھرتے ہیں اور وہ بھی ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے لیکن — ہاں لیکن مسجد کے یہ مینار اُن دیوانوں کو تلاش کر رہے ہیں جو اپنا خونِ جگر پلا پلا کر اُمّت کی کھیتی کو سینچیں، ملّت کی کھیتی کو پروان چڑھائیں کیونکہ ؎

"نقش سب ہیں ناتمام، خونِ جگر کے بغیر ❊ نغمہ ہے سودائے خام خونِ جگر کے بغیر!"

اور اب یہ سامنے امرتسر کا ریلوے اسٹیشن آچکا ہے۔ ایک زمانہ تھا کہ ریل یہاں سے سیدھی لاہور جاتی تھی۔ لاہور اور امرتسر کا کوئی فاصلہ ہی نہ تھا۔ دونوں شہروں کی حیثیت —— TWIN CITIES کی تھی اور اب ایک لکیر نے بہت ہی زیادہ فاصلے بڑھا دیئے۔ ہم الگ، تم الگ والا معاملہ ہو گیا۔ پھر ایک وقت آیا کہ مشرقی پنجاب کے دیگر اسٹیشنوں کی طرح یہ اسٹیشن بھی مسلمانوں کا مذبح خانہ بن گیا۔ مسلم کے خون کی یہاں وہ ارزانی ہوئی کہ الامان والحفیظ! چہار طرف خون ہی خون۔ کسی مسلمان کا یہاں سے بخیریت گذرنا ممکن نہ رہا۔ اسپیشل ٹرینیں تہ تیغ کر دی گئیں۔ پلیٹ فارم خون میں نہا گئے۔ ابلیس ننگا ناچ ناچا اور چشمِ فلک نے بھی اس منظر

پر لرودیا — ہرطرف درندوں اور بھیڑیوں کا راج تھا بقول جگر مراد آبادی مرحوم سے

دل کی جراحتوں کے کھلے ہیں چمن چمن ــــ ٭ ــــ اور اُس کا نام فصلِ بہاراں لیے آج کل
انسانیت کے بھیس میں روحِ درندگی ــــ ٭ ــــ انسان کے لباس میں شیطاں ہے آج کل
ہے زخمِ کائنات جو ہندو ہے ان دنوں ــــ ٭ ــــ ہے داغِ زندگی جو مسلماں ہے آج کل
انسانیت کہ جس سے عبارت ہے زندگی ــــ ٭ ــــ انساں کے سائے سے بھی گریزاں ہے آج کل

اور پھر زمانہ نے ایک اور کروٹ لی، سکھوں کو کچھ احساس ہوا کہ درندہ بن کر وہ کیا کر رہے ہیں- حالات بدلتے گئے — اور آج ہم اُسی امرتسر ریلوے اسٹیشن کے فرسٹ کلاس ویٹنگ روم میں بیٹھے ہوئے ہیں- ڈاکٹر صاحب کو یہاں بھی کچھ لوگوں نے پہچان لیا، یہ حضرات پاکستان سے انڈیا جا رہے تھے- ایک صاحب نے ہمیں کافی کی دعوت دی جو ہم نے قبول کر لی- پاکستان کے مقابلے میں چیزیں سستی ہیں- چائے ۳۰ پیسے، کافی ۶۰ پیسے اور وہ بھی ہمارے ہاں کے اسٹیشنوں کے مقابلے میں QUANTITY اور QUALITY دونوں کے اعتبار سے بہت بہتر- سب سے پہلا کام یہ کیا کہ شام کو علی گڑھ جانے والی ٹاٹا نگر ایکسپریس میں فرسٹ کلاس میں برتھ ریزرویشن کرا لیا- یہاں پر تھرڈ کلاس کو سیکنڈ کلاس کر دیا گیا ہے- لیکن فرسٹ کلاس وہی پرانی ہے- اس وجہ سے سیکنڈ اور فرسٹ کے کرایوں میں تقریباً چار گُنے کا فرق ہے جس کا ہمیں بعد میں پتہ چلا- پاکستان میں ہم نے سنا تھا کہ انڈیا میں ریلوے کا نظام بہت بہتر ہے، لیکن ہمیں جو بات یہاں نظر آئی وہی وہاں بھی کوئی فرق نہیں- بہت سی گاڑیاں چل رہی ہیں لیکن رش بے پناہ- فرسٹ کلاس تک کا بیت الخلاء بہت گندہ، صفائی کا ناقص انتظام- ایک خاص بات جو ہم نے یہاں نوٹ کی وہ یہ ہے کہ بھارت کے لوگ عام طور پر محنتی اور کفایت شعار ہیں، جب کہ ہمارے ہاں تعیش اور تن آسانی راہ پا رہی ہے- وہاں بہت سادگی ہے، بازاروں میں بیرونی ممالک کی اشیاء نظر نہیں آتیں، معلوم ہوا کہ پابندی ہے، جیسی بُری بھلی چیز ہے بس اپنے ملک کی ہے جبکہ ہمارے بازار غیر ملکی اشیاء سے بھرے پڑے ہیں اور ہم قرض لے کر عیش کر رہے ہیں- ریزرویشن سے فارغ ہو کر میں نے علی گڑھ اپنے چچا زاد بھائی اور بہنوئی قاضی عبدالخالق کو اپنی آمد کا تار دے دیا- عبدالخالق علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں ڈپٹی رجسٹرار ہیں- اسٹیشن سے باہر آ کر ایک سائیکل رکشہ میں جلیانوالہ باغ دیکھنے گئے- معلوم ہوا کہ رکشہ ڈرائیور مسلمان ہے- اُس نے بتایا کہ مشرقی پنجاب میں اور خصوصاً امرتسر میں مسلمان آ کر بسنے شروع ہو گئے

ہیں۔ امرتسر میں مسلمانوں کے متعدد چائے خانے اور رہائشی ہوٹل ہیں۔ مسلمان کشمیر سے خاصی تعداد میں آگئے ہیں، اس لئے امرتسر کی مساجد بھی آباد ہیں۔ ہندوستان کے تمام شہروں میں سواری کے لئے سائیکل رکشہ عام ہیں۔ یہاں تک کہ دہلی میں بھی یہی عام سواری ہے جو خاصی سستی ہے۔ شروع میں بیٹھنے کو طبیعت مشکل ہی سے آمادہ ہوئی۔ یہ دیکھ کر کہ آدمی، آدمی کو کھینچ رہا ہے۔ بہت سے ایسے رکشہ ڈرائیور دیکھے کہ ہڈیوں کا پنجر معلوم ہوتے تھے لیکن رکشہ چلا رہے تھے۔ اُن کی حالت دیکھ کر بہت افسوس ہوا۔ پاکستان کے بڑے شہروں میں عرصہ ہوا کہ انسانی نقطۂ نگاہ سے یہ سواری قانوناً بند کر دی گئی۔

ٹاٹا نگر ایکسپریس گو خاصی تاخیر سے آئی تھی، لیکن شام کو اپنے وقت کے مطابق ٹھیک سات بجے امرتسر سے واپس روانہ ہو گئی۔ علی گڈھ صبح آٹھ بجے گاڑی پہنچی۔ اسٹیشن پر کوئی لینے نہیں آیا تھا۔ پتہ چلا کہ کل دوپہر دو بجے کا روانہ کردہ ایکسپریس ٹیلیگرام اُن کو نہیں ملا۔ بعد میں آج رات کو پہنچا، گویا پیدل چل کر آرہا ہو۔ یہ تھا یہاں کا ڈاک کے تار کا نظام ؛

علی گڈھ میں چھ دن

۴ر فروری بروز پیر صبح ۸ بجے ہم لوگ علی گڈھ پہنچے اور ۱۰ر فروری کو صبح ۹ بجے وہاں سے روانہ ہوئے۔ گویا علی گڈھ میں ہمارا قیام چھ دن رہا۔ یہ دن اس لحاظ سے نہایت اہم رہے کہ اس دوران وہاں پر خاصا دعوتی کام ہوا۔ صبح فجر کے بعد سے رات کے گیارہ، بارہ بجے تک کا ایک ایک لمحہ ہمارا دعوتی کاموں میں صرف ہوا۔ علی گڈھ میں ڈاکٹر صاحب کو جو استقبالیہ (RECEPTION) ملا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ چلتے وقت سان گمان میں بھی نہ تھا۔ لیکن اللہ تعالیٰ جس سے جو کام لینا چاہتا ہے لیتا ہے اور جن کے دلوں کو کھولنا چاہتا ہے، کھول دیتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کی پُراثر شخصیت نے یہاں کے لوگوں کے دلوں اور دماغوں پر اپنے ڈیرے ڈال دیئے ہیں اور یہاں کے لوگ بھی کون؟ ——— یونیورسٹی کے بہت سے اہل علم، ڈاکٹر، ریڈر پروفیسر، لیکچرار اور عام طلباء ——— یہاں پر ہمارے کام کا چھوٹا سا ہی سہی ایک BASE بن گیا ہے، اگر مزید کام کیا جائے تو اُمید ہے کہ یہ BASE بڑا ہوتا چلا جائے گا اور اللہ کی ذات سے اُمید ہے کہ یہ چھوٹا سا پودا آئندہ چل کر ایک بڑے اور گھنے درخت میں تبدیل ہو سکتا ہے، جس کی چھاؤں میں سسکتی انسانیت کو امن و سکون ملے ؛

علی گڈھ مسلم یونیورسٹی کا ماحول ہماری یونیورسٹیوں سے بالکل مختلف ہے۔ یہاں مکمّل علمی ماحول ہے۔ ایک ایک شعبہ میں یہاں متعدّد پی۔ ایچ۔ ڈی ملیں گے۔ جن میں سے متعدّد علم کے میدان میں قلم کے جوہر دکھا رہے ہیں۔ یہاں اُستاد پڑھاتے اور لڑکے پڑھتے ہیں، اس طرح نہیں کہ ہمارے ہاں، تعلّد کہ ایک مذاق بنایا ہوا ہے۔ ہماری یونیورسٹیوں کے متعدّد شعبے ایسے ملیں گے جہاں ایک بھی ڈاکٹر نہیں ہوگا۔ دوسری خوبی جو ہمیں یہاں نظر آئی وہ یہاں کی بلا کی سادگی ہے۔ یونیورسٹی کے علاقے میں کار خال خال ہی نظر آئے گی۔ ڈاکٹر، پروفیسر وغیرہ سائیکلوں پر آتے ہیں یا سائیکل رکشاؤں پر۔ "ہم بھی کچھ ہیں" اور رکھ رکھاؤ والی بات یہاں نظر نہیں آئے گی۔ تصنّع نام کو نہیں۔ بقولِ شاعر ؎

صنعت پہ ہو فریفتہ عالم اگر تمام ❊ ہاں سادگی سے آئیو اپنی نہ باز تو!

جب کہ ہمارے ہاں تصنّع نے ہر طرف اپنے جھنڈے گاڑے ہوئے ہیں۔ علم کو وہ سمجھتے بھی ہیں اور علمی شخصیّت کی قدر بھی کرتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ پاکستان کی کسی یونیورسٹی نے ڈاکٹر صاحب کی وہ قدر نہیں کی جس کے وہ مستحق تھے کہ "ایسی چنگاری بھی یارب اپنی خاکستر میں ہے!"۔ لیکن سینکڑوں میل دُور ایک دوسرے ملک کی یونیورسٹی نے ڈاکٹر صاحب کی جو پذیرائی اور عزّت افزائی کی اور انہیں جو اعزاز بخشا حقیقت یہ ہے کہ یہ علی گڈھ یونیورسٹی کے لوگوں کی عظمت کی دلیل ہے، کیونکہ جوہر کی قدر تو جوہری ہی کر سکتا ہے۔ مضمون طویل ہوتا جا رہا ہے۔ اب میں مختصر طور پر ہر روز کی ڈائری پیش کرتا ہوں۔

۴ / فروری بروز پیر | دوپہر کو گھر پر آرام کرنے کے بعد شام کو بالائے قلعہ غازی عزیز صاحب سے ملنے اُن کے گھر گئے۔ غازی صاحب سے قارئینِ 'میثاق' واقف ہوں گے کیونکہ اُن کے مضامین شائع ہوتے رہتے ہیں۔ علی گڈھ سے وہ بغرضِ ملازمت سعودی عرب جا چکے تھے، لیکن ابھی حال ہی میں اُن کا خط ڈاکٹر صاحب کو لاہور میں ملا تھا، جس پر علی گڈھ کا پتہ تحریر تھا۔ یہ سمجھ کر کہ وہ علی گڈھ میں ہوں گے، ہم اُن کے گھر گئے مگر پتہ چلا کہ یہ ہماری غلط فہمی تھی وہ سعودی عرب ہی میں ہیں۔ البتّہ اُن کے والدِ محترم مولانا محمّد امین اثری صاحب سے ملاقات ہو گئی جو خود ایک بڑے عالمِ دین ہیں، مسلکاً اہلِ حدیث ہیں اور جماعتِ اسلامی ہند کے رکن ہیں۔ موصوف کا مضمون بھی 'میثاق' میں شائع ہو چکا ہے۔ وہاں پر خاصی دیر تک ایک نشست رہی جس میں علی گڈھ شہر کے امیرِ جماعت کے علاوہ دو

تین ارکانِ جماعت اور چند دوسرے احباب شریک تھے۔ ملکی، دینی، سیاسی اور جماعتی مسائل پر دیر تک ڈاکٹر صاحب سے تبادلۂ خیال ہوتا رہا۔ معلوم ہوا کہ مولانا محمد امین اثری صاحب 'میثاق' نہایت ذوق و شوق سے پڑھتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کے کتابچے بھی مطالعہ کر چکے ہیں اور ہماری دعوت سے خاصے متأثر ہیں۔ ان جیسی بزرگ شخصیت اور سادگی بے پناہ نہایت شفقت سے پیش آئے۔ انڈیا میں ہم نے یہ محسوس کیا کہ جماعتِ اسلامی کے اکثر لوگوں میں ڈاکٹر صاحب سے متعلق کوئی تعصب نہیں پایا جاتا جیسا کہ یہاں پایا جاتا ہے۔ وہ ہماری بات سنتے ہیں۔ ہمیں یہ بھی انکشاف ہوا کہ جماعت اور اس سے باہر کا ایک بہت بڑا حلقہ ڈاکٹر صاحب کی ذات سے پہلے سے واقف ہے۔ ڈاکٹر صاحب وہاں کوئی غیر معروف شخصیت نہ تھے۔ علمی حلقوں میں گفتگو کرنے سے پتہ چلا کہ ڈاکٹر صاحب کے کتابچے خصوصاً "اسلام کی نشأۃِ ثانیہ" لوگوں نے پڑھی ہوئی ہے۔ "تحریکِ جماعتِ اسلامی" بھی خاصی پھیلی ہے۔ اسی وجہ سے جہاں بھی ڈاکٹر صاحب گئے اور جن لوگوں سے بھی ملے اُن کی اکثریت ڈاکٹر صاحب کے نظریات سے پہلے سے واقف نکلی ؛

رات گئے جب گھر واپس آئے تو وہاں دو حضرات ہمارے منتظر تھے (۱) ڈاکٹر احمد سورتی صاحب، جو یونیورسٹی میں کیمسٹری ڈیپارٹمنٹ میں ہیں۔ کئی سال تک جماعتِ اسلامی، ہند کے رکن رہ چکے تھے۔ لیکن اختلافات کی وجہ سے استعفیٰ دے دیا۔ وہاں جا کر ہمیں اندازہ ہوا کہ جماعتِ اسلامی ہند سے بھی بہت سے لوگ اختلافات کی بنا پر علیحدہ ہو چکے ہیں۔ ان میں بہت سی اعلیٰ علمی شخصیتیں بھی شامل ہیں۔ ڈاکٹر احمد سورتی کے علاوہ علی گڈھ میں دو اور ایسے حضرات سے ملاقات ہوئی، ان میں سے ایک ہیں ڈاکٹر ابن فرید صاحب اور دوسرے ڈاکٹر فضل الرحمٰن ندوی صاحب۔ (۲) جناب اختر الواسع۔ یہ ایک نوجوان ہیں جو اسلامک سٹڈیز ڈیپارٹمنٹ میں لیکچرار ہیں۔ انہوں نے انگریزی میں لکھی ہوئی اپنی ایک کتاب کے دو نسخے بھی ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں پیش کئے۔

رات دیر تک دونوں حضرات کا ڈاکٹر صاحب کے ساتھ تبادلۂ خیال رہا۔ ڈاکٹر احمد سورتی صاحب کی محبت کا تو یہ حال رہا کہ جب بھی موقع ملتا ڈاکٹر صاحب کے پاس آجاتے۔ گویا اُن سے ملنے کے لئے ہر وقت بے چین ہوں۔

۵ رفروری بروزِ منگل | صبح ہی صبح ڈاکٹر احمد سورتی صاحب تشریف لے آئے۔ اُن کے ساتھ اسلامک سٹڈیز ڈیپارٹمنٹ کے ایک پروفیسر عضد الدّین صاحب بھی تشریف لے آئے جو اس سے قبل پاکستان میں ڈاکٹر صاحب سے ملاقات کر چکے تھے۔ علمی و دینی مسائل پہ دیر تک تبادلۂ خیال جاری رہا ؎

جماعتِ اسلامی ہند نے اپنا ادارۂ تصنیف علی گڈھ میں قائم کیا ہوا ہے، جس کے سربراہ جناب مولانا جلال الدّین انصر عمری صاحب ہیں، جو نہ صرف معروف عالمِ دین ہیں بلکہ کئی کتب کے مصنّف بھی ہیں۔ کئی حضرات اُن کے معاون ہیں، جن میں جناب سلطان احمد صاحب اصلاحی، جناب محمد اسرار خان اور کشمیر (بارہ مولا) کے ایک نوجوان جناب حامد نسیم ہیں۔ اِن حضرات کو جب ڈاکٹر صاحب کی آمد کی اطّلاع ملی تو رات کہلا بھیجا کہ آج گیارہ بجے ڈاکٹر صاحب اُن کے ہاں تشریف لائیں۔ وقت کے مطابق ڈاکٹر صاحب وہاں تشریف لے گئے۔ مولانا انصر عمری صاحب اور اُن کے رُفقاء نہایت تپاک سے پیش آئے، ان کے ساتھ بھی دیر تک تبادلۂ خیال جاری رہا ؎

دوپہر دو بجے مولانا محمّد امین اثری صاحب ملاقات کے لئے تشریف لے آئے۔ آج رات بالائے قلعہ جامع مسجد کے قریب چورا ہا چندن شہید پر انہوں نے ایک جلسۂ عام کا اہتمام کیا تھا، جس کے اصل مقرر ڈاکٹر صاحب تھے، موضوع سیرتِ نبوی تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے دعوت قبول کر لی۔ ڈاکٹر صاحب کے کتابچوں کا ایک سیٹ مولانا اثری صاحب کو دیا گیا۔ 'میثاق' کے "نقضِ غزل" والے شمارے مطالعہ کے لئے لے گئے ؎

مغرب کے وقت ادارۂ تصنیف جماعتِ اسلامی ہند کے سربراہ مولانا جلال الدّین صاحب انصر عمری گھر پہ تشریف لے آئے اور مختلف مسائل پر گفتگو فرمائی ؎

عشاء کے بعد بالائے قلعہ جلسے میں جانا تھا۔ اس جلسہ میں مولانا سعید احمد صاحب اکبر آبادی مُدیر "البرہان" اور علی گڈھ یونیورسٹی کے شعبۂ اسلامک سٹڈیز کے وزٹنگ پروفیسر بھی مدعو تھے۔ منتظمین نے عشاء سے قبل گاڑی بھیج دی تھی۔ جس میں پہلے ڈاکٹر صاحب بیٹھے، پھر گاڑی مولانا سعید احمد صاحب اکبر آبادی کے گھر اُنہیں لینے گئی۔ وہیں ڈاکٹر صاحب مولانا سے ملے۔ مولانا، ڈاکٹر صاحب کو اپنے گھر پاکر بہت خوش ہوئے۔ عشاء کے بعد جلسہ شروع ہوا۔ علی گڈھ میں گذشتہ سال کئی بار فرقہ وارانہ فسادات ہو چکے تھے۔ فضا میں کشیدگی کے معمولی سے اثرات ابھی تک موجود تھے

اس وجہ سے جلسہ کی اجازت بہت مشکل سے ملی۔ جلسہ کی صدارت مفتیٔ شہر مولانا عبدالقیوم صاحب نے کی۔ مولانا سعید احمد اکبر آبادی صاحب نے مختصر تقریر کی۔ طویل تقریر ڈاکٹر صاحب کی تھی جو بہت پسند کی گئی۔ صدرِ جلسہ پاکستان جا چکے تھے اور ٹیلیویژن پر رمضان المبارک میں ڈاکٹر صاحب کا درسِ قرآن سُنتے رہے تھے، اس لئے نہ صرف پہلے سے واقف بلکہ خاصے متأثر تھے۔

۶ فروری بروز بدھ | کل ڈاکٹر صاحب خاصے تھک چکے تھے، اس لئے آج آرام کرنا چاہا۔ لیکن ملاقات کے لئے آنے والے لوگوں کا تانتا بندھا رہا۔ میزبان قاضی عبدالخالق صاحب جو یونیورسٹی میں ڈپٹی رجسٹرار ہیں، انہوں نے ایک بڑے حلقے میں ڈاکٹر صاحب کا تعارف کرایا۔ جس کسی کو ڈاکٹر صاحب کی آمد کا علم ہوا فوراً ملاقات کے لئے آتا تھا۔ ڈاکٹر صاحب دینی و علمی سوالات کے جوابات کے ساتھ لوگوں کو اس کام سے متعارف کراتے تھے جو وہ پاکستان میں کر رہے ہیں۔

پاکستان کی اسلامی جمعیّت طلباء کی طرح بھارت میں مسلمان طلباء کی جماعت کا نام "سٹوڈنٹس اسلامک موومنٹ" (STUDENTS ISLAMIC MOVEMENT) (S.I.M.) ہے۔ انہیں بھی معلوم ہو گیا تھا کہ ڈاکٹر صاحب علی گڑھ آئے ہوئے ہیں۔ چنانچہ کچھ لوگ ڈاکٹر صاحب سے ملاقات کے لئے آئے اور ڈاکٹر صاحب کو اپنے مرکز آنے کی دعوت دی۔ اس سلسلہ میں اُن کا ایک باقاعدہ تحریری دعوت نامہ ہمیں کل موصول ہوا۔ بعد نمازِ مغرب بدر باغ میں سٹوڈنٹس اسلامک موومنٹ (S.I.M.) کے مرکز ڈاکٹر صاحب تشریف لے گئے۔ مرکزی اور مقامی ارکان نے ڈاکٹر صاحب کا استقبال کیا۔ تحریکی کاموں وغیرہ کے سلسلہ میں متعدّد سوالات کئے گئے، جن میں بعض چبھتے ہوئے سوالات بھی شامل تھے۔ بہر حال ڈاکٹر صاحب نے اپنی طرف سے نہایت تسلّی بخش جوابات دیئے اور اپنے موقف کی بھرپور وضاحت فرمائی۔ ڈاکٹر صاحب کے کتابچوں کا ایک سیٹ "سٹوڈنٹس اسلامک موومنٹ" کی لائبریری کے لئے پیش کیا گیا۔ ایس آئی ایم کی جانب سے بھی اُن کی کتب کا ایک سیٹ ہمیں دیا گیا۔

رات کو ڈاکٹر صاحب ڈاکٹر احمد سورتی صاحب کے مکان پر تشریف لے گئے وہاں پر ہفتہ وار "ہجوم" دہلی کے مُدیر بھی موجود تھے، جو اس سے پہلے گھر پر اپنے پرچے کے لئے ڈاکٹر صاحب کا انٹرویو لینے آچکے تھے، لیکن ملاقات نہ ہو سکی تھی۔ رات

چونکہ زیادہ ہوچکی تھی اس لئے انٹرویو تو نہیں لیا جا سکا، البتہ دونوں حضرات سے تبادلۂ خیالات ہوتا رہا ؛

۷ فروری بروز جمعرات | یونیورسٹی کے شعبۂ اسلامک سٹڈیز کی جانب سے آج صبح گیارہ بجے ڈاکٹر صاحب کو چائے پہ مدعو کیا گیا۔ حاضرین میں لیکچرار اور پروفیسر حضرات کے علاوہ چار یا پانچ ڈاکٹر بھی موجود تھے۔ جن میں ڈاکٹر اقبال احمد انصاری صاحب، ڈاکٹر فضل الرحمٰن ندوی صاحب، ڈاکٹر محمود الحق صاحب کے نام یاد ہیں۔ ان کے علاوہ پروفیسر عقد الدین صاحب، پروفیسر اختر الواسع صاحب اور دوسرے پروفیسر حضرات موجود تھے۔ مولانا سعید احمد اکبر آبادی نے ڈاکٹر صاحب کا استقبال کیا۔ دیر تک سوالات و جوابات کی نشست رہی۔ سب حضرات ڈاکٹر صاحب سے متأثر تھے۔ اُن میں ڈاکٹر محمود الحق صاحب نے جو اسلامک سٹڈیز ڈیپارٹمنٹ سے متعلق ہیں لیکن اپنے خیالات کے اعتبار سے مارکسسٹ معلوم ہوتے ہیں، تابڑ توڑ سوالات کرنے شروع کئے، سوالات بھی بے تکے اُلجھے ہوئے۔ ایک سوال کا جواب پورا ہو نہیں پاتا تھا کہ دوسرا سوال شروع کر دیتے تھے۔ آخر کو ڈاکٹر صاحب کو کہنا پڑا کہ کیا آپ میرا امتحان لینا چاہتے ہیں۔ دراصل وہ صاحب اس طرح ڈاکٹر صاحب کو پریشان کرنا چاہتے تھے لیکن ناکام رہے۔ دوسرے حضرات جو اُن کے خیالات سے واقف تھے، اِس صورتِ حال پر پیچ و تاب کھاتے رہے ؛

دوپہر کا کھانا ڈاکٹر صاحب نے مولانا سعید احمد اکبر آبادی صاحب کے ہاں تناول فرمایا۔ مولانا اکبر آبادی صاحب شعبۂ اسلامک سٹڈیز میں وزٹنگ پروفیسر (VISITING PROFESSOR) ہیں۔ ایک بار پاکستان آئے ہوئے تھے۔ ہماری قرآن کانفرنس ہو رہی تھی۔ ڈاکٹر محمد اسلم صاحب ان کو لے آئے۔ چنانچہ موصوف نے بھی اس میں تقریر فرمائی۔ ساتویں سالانہ قرآن کانفرنس میں شرکت کی ہماری دعوت مولانا موصوف نے منظور فرمائی ہے ؛

ڈاکٹر احمد سورتی صاحب اس دوران ڈاکٹر صاحب سے برابر ملاقاتیں کرتے رہے۔ موصوف نے ایک سوسائٹی RADICAL SOCIETY کے نام سے بنائی ہے، جس کے آپ صدر ہیں۔ آپ نے آج شام چار بجے ڈاکٹر صاحب کو سوسائٹی کے اجتماع (کینیڈی ہاؤس) میں شرکت کی دعوت دی۔ تقریر کا موضوع تھا:

"PROPECTS OF ISLAMIC REVIVAL"

اس سلسلہ میں سوسائٹی کی جانب سے ایک سائیکلو اسٹائل سرکلر یونیورسٹی کے تمام شعبوں میں بھیجا گیا۔ سوسائٹی کے ارکان یونیورسٹی کے اکثر اساتذہ ہیں۔ عصر اور مغرب کے مابین ڈاکٹر صاحب کی تقریر ہوئی۔ پروفیسروں اور لیکچرارز کے علاوہ صرف ڈاکٹروں کی تعداد ایک درجن سے کم نہیں ہوگی۔ تقریباً تمام شعبوں کے اساتذہ اس میں شریک تھے۔ تقریر نہایت مُدلّل اور اثر انگیز تھی اور علی گڈھ کا علمی حلقہ اس سے بہت متأثر ہوا۔ ؞

جماعتِ اسلامی ہند کے ادارۂ تصنیف کے سربراہ جناب جلال الدّین صاحب انصر عمری نے ڈاکٹر صاحب کو مدعو کیا۔ ادارہ کے رُفقاء کے علاوہ جماعت کے کچھ اور حضرات بھی شریک ہوئے، جن میں جماعتِ اسلامی ہند کے محاسب جناب احسان محمد خاں صاحب اور ڈاکٹر نجات اللہ صدّیقی صاحب کے چھوٹے بھائی جناب احمد اللہ صدّیقی صاحب بھی موجود تھے۔ دیر تک دینی و علمی مسائل پر گفتگو ہوتی رہی۔ اسلامی تحقیق، اُس کا مدّعا اور طریقِ کار پر ڈاکٹر صاحب سے متعدّد سوالات کئے گئے، جن کے ڈاکٹر صاحب نے تشفّی بخش جوابات دیئے۔ متعدّد اُمور پر ڈاکٹر صاحب سے مشورے بھی حاصل کئے گئے۔ اِس موقع پر ادارۂ تصنیف و تالیف کو ڈاکٹر صاحب کے کتابچوں کا ایک سیٹ پیش کیا گیا ؞

__۸ ، فروری بروز جمعہ__ آج بھی متعدّد حضرات ڈاکٹر صاحب سے ملاقات کے لئے تشریف لاتے رہے، جن میں ڈاکٹر معین فاروقی صاحب ریڈر ZOOLOGY - اور ڈاکٹر فضل الرّحمن صاحب ندوی اسلامک سٹڈیز ڈیپارٹمنٹ .DEPTT شامل ہیں ــــ جماعتِ اسلامی ہند کے محاسب جناب احسان محمّد خان صاحب نے اپنے گھر پر ڈاکٹر صاحب کو عصرانہ دیا۔ جن میں ادارۂ تصنیف و تالیف کے رُفقاء، جماعتِ اسلامی کے متعدّد ارکان اور یونیورسٹی کے اساتذہ شریک تھے ؞

بعد مغرب مولانا محمّد تقی امینی صاحب (شعبۂ دینیات) سے اُن کے گھر پر ملاقات کی اور نہایت تفصیلی اور مفید گفتگو رہی۔ وہ ڈاکٹر صاحب کی متعدّد کتابوں کا پہلے سے مطالعہ کر چکے تھے۔ مولانا موصوف خود ایک بلند پایہ مُصنّف ہیں، فقہ پر اُن کی کئی کتب ہیں۔ "احتساب" کے نام سے علی گڈھ سے ہفتہ وار پرچہ نکالتے ہیں ــــ جو "صدقِ جدید" کے اسٹائل پر ہے۔ ڈاکٹر صاحب اور مولانا موصوف کے خیالات میں دینی، سیاسی اور تحریکی مسائل میں حیرت انگیز مماثلت پائی گئی۔ مولانا کی خدمت میں بھی

ڈاکٹر صاحب کے کتابچوں کا ایک سیٹ پیش کیا گیا، نیز مولانا محترم کو ساتویں سالانہ قرآن کانفرنس میں شرکت کی دعوت دی گئی جو موصوف نے قبول فرمالی ؛

۹ ؍فروری بروز ہفتہ | شعبۂ اسلامک اسٹڈیز کے قائم مقام سربراہ جناب ڈاکٹر محمد اقبال انصاری صاحب نے آج ناشتہ پر ڈاکٹر صاحب کو مدعو کیا، مفید تبادلۂ خیال ہوا — پرسوں ریڈیکل سوسائٹی (RADICAL SOCIETY) کے اجتماع میں ڈاکٹر صاحب کی تقریر سے متأثر ہو کر ڈاکٹر احمد سورتی صاحب، ڈاکٹر محمد اقبال انصاری صاحب اور چند دوسرے احباب اُسی رات پروگرام بنا کر ڈاکٹر صاحب کے پاس گھر پہ تشریف لائے۔ اُن کا پروگرام یہ تھا کہ یونیورسٹی کی جانب سے ڈاکٹر صاحب کے اعزاز میں ایک اجتماعِ عام کا اہتمام کیا جائے، جس میں سیرتِ نبوی پر ڈاکٹر صاحب کی تقریر ہو۔ اسی وقت وائس چانسلر صاحب سے رابطہ قائم کیا گیا، جنھوں نے نہ صرف اس کی منظوری دی، بلکہ صدارت بھی قبول فرمالی۔ اُسی وقت ہینڈ بل اور پوسٹر کی عبارت تیار کی گئی۔ ڈاکٹر احمد سورتی صاحب، ڈاکٹر اقبال انصاری صاحب، چند دیگر احباب اور رفاعی عبدالخالق صاحب ڈپٹی رجسٹرار نے بڑھ چڑھ کر سرگرمی سے حصّہ لیا۔ کل ایک دن میں ہینڈ بل اور پوسٹر کی طباعت کرائی گئی۔ رات کو کیمپس اور ملحقہ علاقوں میں جگہ جگہ ڈاکٹر صاحب کی تقریر کے بڑے بڑے پوسٹر چسپاں تھے۔ یونیورسٹی کی جانب سے تمام شعبوں کو سرکلر اور اطلاع نامے بھیجے گئے۔ آج صبح تمام شعبوں میں طلباء میں ہینڈ بل تقسیم کئے گئے۔ اس طرح کم وقت میں جتنی پبلسٹی کی جا سکتی تھی، کرنے کی کوشش کی گئی۔ ساڑھے گیارہ بجے یہ جلسہ کینیڈی ہال میں ہونا تھا۔ فورڈ فاؤنڈیشن کی مدد سے یہ وسیع و عریض ہال امریکن طرز پر چند سال قبل ہی تعمیر ہوا تھا۔ مجھے یاد آیا کہ آج سے چالیس سال قبل ۱۹۴۰ء میں علی گڑھ یونیورسٹی کے اسٹریچی ہال میں مولانا مودودی مرحوم نے: "اسلامی حکومت کس طرح قائم ہوتی ہے؟" کے موضوع پر اپنا مشہور مقالہ پڑھا تھا۔ مولانا مودودی مرحوم نے اپنے اس مقالے میں اسلامی حکومت کے قیام کا جو PROCESS بتایا تھا، افسوس کہ وہ اور ان کی جماعت اس سے منحرف ہو گئے۔ مگر ٹھیک چالیس سال کے بعد (جو عقل کی بلوغت کا عرصہ ہوتا ہے) ۱۹۸۰ء میں اسی یونیورسٹی کے کینیڈی ہال میں آج وہ شخص تقریر کرنے والا تھا جو ایک چھوٹے سے قافلے کو ٹھیک اسی راہ پر لے کر جا رہا ہے، جس کی نشاندہی اسی مقام پہ

مولانا مودودی مرحوم نے کی تھی، مگر خود اس سے منحرف ہو گئے تھے :

تِلْكَ الْاَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ ط

کم وقت میں پبلسٹی کے باوجود وسیع و عریض ہال طلباء اور اساتذہ سے بھر چکا تھا۔ ساڑھے گیارہ بجے ڈاکٹر صاحب تشریف لائے۔ اسٹیج پر صدارتی کرسی پہ پروفیسر محمد شفیع صاحب وائس چانسلر بیٹھے تھے۔ ان کے ایک جانب ڈاکٹر صاحب اور دوسری جانب مولانا سعید احمد اکبر آبادی صاحب تشریف فرما تھے۔ ڈاکٹر محمد اقبال انصاری صاحب اسٹیج سیکرٹری کے فرائض انجام دے رہے تھے۔ تلاوتِ کلام پاک کے بعد سب سے پہلے وائس چانسلر صاحب نے ڈاکٹر صاحب کو خوش آمدید کہا اور مختصر الفاظ میں نہایت جامع تعارف کرایا۔ واقعہ یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب کے لئے یہ ایک بہت بڑا اعزاز تھا۔ وائس چانسلر کے بعد ڈاکٹر اقبال انصاری صاحب نے ڈاکٹر صاحب کا تفصیلی تعارف کرایا اور خوب کرایا۔ اس کے بعد ڈاکٹر صاحب کو خطاب کی دعوت دی گئی، خطاب کا موضوع تھا "سیرتِ نبوی کا انقلابی پہلو" ڈاکٹر انصاری صاحب نے ڈاکٹر صاحب کو شروع میں یہ کہہ دیا تھا کہ پون گھنٹہ سے زائد تقریر نہ ہو۔ ڈاکٹر صاحب نے تقریباً ایک گھنٹہ اتنی اثر انگیز تقریر فرمائی کہ ڈاکٹر انصاری صاحب نے بعد میں ڈاکٹر صاحب کے سامنے کئی بار اس بات پر افسوس کا اظہار کیا کہ انہیں وقت کا پابند کیوں کیا گیا۔ ڈاکٹر انصاری کے ذہن میں یہ بات تھی اور اس کا تجربہ بھی تھا کہ دینی موضوعات پر طویل تقریروں سے طلباء اُکتا کر جانا شروع کر دیتے ہیں اور اس طرح جلسہ اکھڑ جاتا ہے، اور وہ ڈاکٹر صاحب کے خطاب کو ایسی "ممکنہ" صورت سے بچانا چاہتے تھے ـــ لیکن واقعہ یہ ہوا کہ کسی کا اٹھنا تو درکنار لوگ ایسے بُت بنے بیٹھے سن رہے تھے جیسے ان پر جادو کر دیا گیا ہو ؎

حقیقت یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب کی ایک گھنٹہ کی یہ تقریر اُن کی زندگی کی ایک تاریخی تقریر تھی۔ "چالیس سال" پھر میرے ذہن میں گردش لگا رہے ہیں۔ اس کے ایک سرے پر ایک مقالہ اور دوسرے سرے پر یہ تقریر۔ دونوں نے تاریخ میں اپنا مقام پیدا کر لیا ہے ـــ لیکن کس طرح ؏ کہ ہم نے انقلابِ چرخِ گرداں یوں بھی دیکھے ہیں ڈاکٹر صاحب کی تقریر میں فکر بھی تھی، فلسفہ بھی تھا، شریعت بھی تھی اور جدید علوم کی

عکاسی بھی، واقعات بھی تھے اور کرنے کا اصل کام بھی۔ ہوش بھی تھا اور جوش بھی تھا۔ لوگ تھے کہ عش عش کر اُٹھے۔ بہت سے لوگوں کو روتے دیکھا ــــ اور لوگ بھی کون ایک علمی گہوارے کے مکین ــــ تقریر کے بعد وائس چانسلر صاحب نے فرمایا کہ "سیرتِ نبوی ؐ پر تقریریں تو مَیں نے بہت سُنی ہیں لیکن اتنی جامع، مربوط، مدلّل اور دلوں کو گرما دینے والی تقریر آج پہلی بار سُنی ہے!" ــــ انہوں نے فرمایا: "میرے ذہن میں بہت سے اشکالات تھے، بہت سے سوالات اٹھتے تھے، آج ان سب کی وضاحت ہوگئی!"۔ مولانا سعید احمد صاحب اکبر آبادی نے بھی ڈاکٹر صاحب کو زبردست خراجِ تحسین پیش کیا ــــ یہاں یہ کہنا بے محل نہ ہوگا کہ ایک جماعت کے چند نادان دوستوں اور حد سے بڑھے ہوئے جذباتی طلباء نے اس بات کی کوشش کی کہ جلسہ نہ ہونے پائے۔ لیکن الحمد للہ ثمّ الحمد للہ! جلسہ ہماری توقّع سے بہت زیادہ کامیاب رہا ــــ

ــــــــــ "یہ رتبۂ بلند ملا جس کو مل گیا!" ــــــــــ

ڈاکٹر صاحب سے ملاقات کے لئے آج بھی متعدّد حضرات گھر پر تشریف لاتے رہے، جن میں سے چند کے نام یہ ہیں: ڈاکٹر ابن فرید صاحب، ڈاکٹر فضل الرّحمٰن ندوی صاحب، مولانا محمّد تقی امینی صاحب، پروفیسر عبد الغفّار شکیل صاحب، مولانا محمّد سلطان اصلاحی صاحب، جناب عشرت علی قریشی صاحب (ڈپٹی لائبریرین)

جامعہ ملّیہ دہلی کے ایک استاد جناب رشید الوحیدی صاحب نے بھی کینیڈی ہال کے جلسہ میں شرکت کی۔ وہ بھی تقریر سے انتہائی متأثر ہوئے، معلوم ہوا کہ انہیں دہلی میں پتہ چلا تو وہ یہ تقریر سُننے کے لئے خاص طور پر علی گڑھ آئے۔ انہوں نے ڈاکٹر صاحب سے درخواست کی کہ قیامِ دہلی کے دوران وہ جامعہ ملّیہ میں خطاب فرمائیں۔ ڈاکٹر صاحب نے قبول فرما لیا، لیکن بدقسمتی سے جمعہ، اتوار، ہفتہ تینوں دن جامعہ ملّیہ میں چھٹی رہی اس لئے خطاب نہ ہوسکا:

سہ پہر بالائے قلعہ سے مولانا محمّد امین اثری صاحب تشریف لائے اور خواہش ظاہر کی کہ اتوار کو ڈاکٹر صاحب شہر میں ایک اور خطاب فرمائیں۔ ڈاکٹر صاحب کو لکھنؤ کے لئے ہفتہ کی صبح روانہ ہوجانا تھا کیونکہ وہاں پر ڈاکٹر صاحب کی ملاقات کے لئے مولانا علی میاں صاحب ٹھہرے ہوئے تھے۔ لیکن یونیورسٹی کی انتظامیہ کے اصرار پر کہ ڈاکٹر صاحب کینیڈی ہال میں ہفتہ کو تقریر فرمائیں، ڈاکٹر صاحب نے

لکھنؤ جانے کے لئے ایک دن کی تاخیر کردی۔ اب مزید ایک اور روز تاخیر کرنا ممکن نہ تھا اس لئے ڈاکٹر صاحب نے مولانا محمد امین اثری صاحب سے معذرت چاہی۔ مولانا محمد امین اثری اور ان کے احباب ڈاکٹر صاحب کو مزید سننا چاہتے تھے۔ ان کے اشتیاق کا یہ عالم تھا کہ انہوں نے اسی روز بعد نمازِ عشاء پٹھان محلہ کی جامع مسجد میں جلسہ کا اہتمام کر لیا۔ ڈاکٹر صاحب نے سیرتِ طیبہ پر عام فہم انداز میں تقریر فرمائی۔ موضوع تھا: "اُمت پر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے حقوق!" یونیورسٹی کے ڈپٹی لائبریرین جناب عشرت علی قریشی صاحب (LINGUISTIC DEPTT.) کے ریڈر پروفیسر عبد الغفار شکیل صاحب اور چند دیگر احباب بھی ڈاکٹر صاحب کے ہمراہ تھے۔ سیرتِ مطہرہ پر آج صبح کی کینیڈی ہال کی تقریر جو اہلِ علم کو مخاطب کر کے کی گئی تھی، اس کا ایک اور انداز تھا اور یہاں پٹھان محلہ کی جامع مسجد میں عام لوگوں کو تخاطب کا انداز کچھ اور ہی تھا، گویا "اِک پھول کا مضموں ہو تو سَو رنگ سے باندھوں!"۔۔۔۔۔۔ والا معاملہ تھا۔

اگلے دن ۱۰ فروری کو صبح ۹ بجے ڈاکٹر صاحب لکھنؤ جانے کے لئے ٹاٹا نگر ایکسپریس سے عازم کانپور ہو گئے۔ مولانا سعید احمد اکبر آبادی صاحب اتنے متأثر تھے کہ فرمانے لگے میں صبح اسٹیشن پر چھوڑنے آؤں گا لیکن ڈاکٹر صاحب نے اُن کے جذبۂ محبت و اخوت کو دیکھتے ہوئے اُن سے گذارش کی کہ وہ یہ زحمت نہ فرمائیں۔۔۔۔۔۔!!

لوگوں کی شدید خواہش تھی کہ ڈاکٹر صاحب علی گڑھ میں مزید قیام فرمائیں، کیونکہ "سمندر سے ملے پیاسے کو شبنم!" والا معاملہ تھا۔ لیکن ڈاکٹر صاحب اپنی شدید مصروفیات کی وجہ سے مزید ٹھہرنے سے قاصر تھے۔ بہرحال وہاں کے احباب نے ڈاکٹر صاحب سے وعدہ لے لیا کہ وہ گاہے گاہے اپنی دعوت کے سلسلے میں علی گڑھ بھی تشریف لاتے رہیں گے!

ان چھ دنوں میں مختلف پروگراموں کے سلسلے میں یوں تو بہت سے حضرات نے اپنے اپنے طور پر بہت کچھ کام کیا، لیکن حقیقت یہ ہے کہ قاضی عبد الخالق صاحب (ڈپٹی رجسٹرار) اور ان کے برادرِ خورد قاضی محمد یونس صاحب نے اس کام کے لئے شب و روز ایک کر دیا۔ اللہ تعالیٰ ان کی محنتوں کو قبول فرمائے، عمل کی توفیق دے اور

اپنے دین کا سپاہی بننے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین ———!!

کانپور میں ایک دن کانپور سے مجھ سے ملاقات کے لئے میرا چھوٹا بھائی قاضی عبدالقدیر علی گڑھ ایک روز کے لئے آیا تھا اور ڈاکٹر صاحب کو خاص طور پر دعوت دے گیا تھا کہ وہ کانپور ضرور تشریف لائیں۔ ڈاکٹر صاحب کو لکھنؤ جانا تھا لیکن چونکہ ٹاٹا ایکسپریس لکھنؤ نہیں جاتی تھی، اس لئے انہوں نے فیصلہ کیا ہمارے ساتھ پہلے وہ کانپور چلیں گے اور وہاں سے بذریعہ بس لکھنؤ جائیں گے۔ کانپور اور لکھنؤ دونوں TWI-N-CITIES ہیں۔ درمیانی فاصلہ پچاس میل کے قریب ہوگا ۔

۱۰ر فروری کی صبح ۹ بجے ہم ٹاٹا نگر ایکسپریس سے کانپور روانہ ہوئے۔ اسٹیشن پر قاضی عبدالخالق، قاضی محمد یونس اور دیگر احباب رخصت کرنے آئے ہوئے تھے۔ ہاتھرس، ٹونڈلہ، اٹاوہ ہوتے ہوئے دوپہر کے کوئی دو بجے ہم کانپور پہنچے۔ اسٹیشن پر قاضی عبدالقدیر اور دیگر احباب استقبال کے لئے موجود تھے۔ گھر جاکر کھانا کھایا، آرام کیا اور ڈاکٹر صاحب اور میں شام کو عبدالقدیر کے ہمراہ کانپور کی سیر کو نکلے۔ مولانا حسرت موہانی روڈ پر شہر کا سب سے بارونق بازار ہے۔ اتوار کی وجہ سے بازار بند تھا لیکن دکانوں کے بند دروازوں کے باہر عارضی بازار لگا ہوا تھا۔ یہیں پر وہ مسجد ہے جس کے برابر ہی ایک مندر ہے، جہاں قبل تقسیم ہندوؤں نے اس پر شدید احتجاج کیا تھا کہ مسجد کے مینار مندر سے اونچے کیوں بنائے گئے ہیں۔ اس پر عرصہ تک ہنگامہ آرائی رہی۔ اس وقت مسجد کے قریب ہی ہندوؤں کا ایک جلسہ ہو رہا تھا۔ جلسہ کیا تھا ایک "جلسی" تھی۔ ایک شامیانہ لگا تھا جس کے نیچے اسٹیج اور اسٹیج کے اوپر مقررین قطار اندر قطار، سامعین ندارد۔ بس یوں سمجھئے کہ دکانوں کے تھڑوں پر بیٹھے ہوئے لوگ سُن رہے تھے، یا پھر "بولتے ہوئے مقرر" کو "خاموش مقرر" سن رہے تھے۔ یوپی اسمبلی میں اُردو کو دوسری زبان کا درجہ دینے کے خلاف دھواں دھار تقریر ہو رہی تھی۔ لالہ جی کہہ رہے تھے کہ اردو ہمارے بچوں کو پڑھنی پڑے گی جو ان کی سمجھ میں نہیں آئے گی۔ الف لام، بڑا لام، ہائی جمپ، لانگ جمپ ہمیں سب پڑھنا پڑے گا۔ ہم ایسا نہیں ہونے دیں گے۔ لطف کی بات یہ ہے کہ لالہ جی تقریر اُردو کے خلاف کر رہے تھے، لیکن اردو میں کر رہے تھے کیونکہ اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا ۔

تقریر دلچسپ تھی، تھوڑی دیر سنی اور ہم آگے بڑھ گئے۔ تین پہیوں پر چلنے والی

موٹر رکشہ سے بڑی ایک سواری دیکھی اس میں چھ افراد بیٹھ سکتے ہیں، یوں آٹھ دس تک بھی بٹھائے جاتے ہیں، اسے یہاں TEMPO کہتے ہیں۔ کمپنی باغ کے سامنے سے اس میں بیٹھ کر ہم چار میل دور دریائے گنگا کے کنارے TANNERIES کے علاقے میں گئے۔ یہاں پر بہت سی ٹینریاں ہیں۔ معلوم ہوا کہ یہاں کی تجارت پر مسلمان چھائے ہوئے ہیں۔ نوّے کے قریب ٹینریاں ہیں جن میں پچھتر سے زائد ٹینریاں مسلمانوں کی ہیں۔ ایک ٹینری پر کم و بیش سات آٹھ کروڑ روپے کا انوسٹمنٹ (INVESTMENT) ہوتا ہے۔ اسی طرح یہاں کے ایک ٹرانسپورٹر حاجی صدّیق صاحب ہیں، جن کی تقریباً اسّی بسیں اور کوئی ایک سو بیس ٹرک چلتے ہیں۔ وہ ٹرانسپورٹ کے بادشاہ کہلاتے ہیں۔ معلوم ہوا کہ بھارت میں مسلمانوں کی معاشی حالت اتنی خراب نہیں جتنی یہاں ہم سمجھتے ہیں۔ ۱۹۷۱ء میں مشرقی پاکستان کی علیحدگی کے بعد ہندوستان کے مسلمانوں میں ایک عظیم تبدیلی آئی۔ ان میں ایک نئی عزم و ہمّت پیدا ہوئی ہے۔ ملک کی سب سے بڑی اقلیت ہونے اور ملک کے سیاسی ڈھانچہ میں اپنے مقام کا احساس پیدا ہوا ہے اور یہ کہ آپ اپنے پیروں پر کھڑے ہونے اور کسی کی طرف نہ دیکھنے کا ایک نیا احساس جاگا ہے۔ ؎

کانپور بہت بڑا صنعتی شہر ہے، لکڑی اور کپڑے کی تجارت پر بھی مسلمان چھائے ہوئے ہیں۔ حالانکہ اُن کی آبادی ایک چوتھائی سے بھی کم ہے۔ دریائے گنگا کے کنارے ایک مزار شریف ہے وہاں پر ہم نے فاتحہ پڑھی اور قریب کی مسجد میں نمازِ عشاء ادا کی۔ رات کو سیر کرتے ہوئے تاخیر سے گھر واپس پہنچے ؎

صبح فجر کی نماز اور ناشتہ کے بعد ڈاکٹر صاحب بذریعہ بس لکھنؤ روانہ ہوگئے اور میں کانپور ہی میں رہا۔ کانپور میں، مَیں نے مولانا امین احسن اصلاحی کے چھوٹے بھائی جناب مشیر احسن اصلاحی صاحب سے ملاقات کی جو وہاں پر کاروبار کرتے ہیں۔ "مدرسۃ الاصلاح" کے فارغ التحصیل ایک صاحب جناب قمر الدّین اصلاحی صاحب سے بھی ملاقات ہوئی۔ یہ صاحب بھی تجارت کرتے ہیں۔ دونوں حضرات سے تبادلۂ خیال ہوا۔ ڈاکٹر صاحب کا کتابچہ "مسلمانوں پر قرآن مجید کے حقوق" ان حضرات کو اور چند دیگر احباب کو پیش کیا۔ سیرتِ طیبہؐ پر ڈاکٹر صاحب کی تقاریر کے چند ٹیپ میں لے گیا تھا، دو جگہ یہ ٹیپ سُنائے گئے اور یہ ٹیپ وہاں پر چھوڑ دیئے گئے۔ کچھ حضرات اس کی نقل (RE-TAPE) کرنا چاہتے تھے ؎

لکھنؤ میں تین دن | ڈاکٹر صاحب بذریعہ بس کانپور سے لکھنؤ پہنچے۔ تین روز کے

بعد وہاں سے دہلی روانگی ہوئی۔ ڈاکٹر صاحب کے لکھنؤ اور دہلی کے قیام کے دوران میرا قیام کانپور اور علی گڈھ میں رہا۔ اس لئے لکھنؤ اور دہلی کی روداد جو ڈاکٹر صاحب کی زبانی معلوم ہوئی اس کا اجمالی تذکرہ درج ذیل ہے :

۱۱ر فروری کی صبح لکھنؤ بس سے اتر کر ڈاکٹر صاحب سیدھے مولانا محمد منظور نعمانی صاحب مدیر "الفرقان" کی قیام گاہ تشریف لے گئے۔ مولانا نعمانی صاحب نے ڈاکٹر صاحب کو لکھنؤ آنے کی دعوت دی تھی۔ مولانا سے ملاقات کر کے ڈاکٹر صاحب ندوہ تشریف لے گئے اس لئے قیام کا انتظام ندوہ میں کیا گیا تھا۔ ندوہ میں ڈاکٹر صاحب کا نہایت گرمجوشی کے ساتھ استقبال کیا گیا۔ دوپہر کا کھانا ندوہ کے تمام اساتذہ کے ساتھ مل کر کھایا۔ کچھ آرام کرنے کے بعد لکھنؤ کی سیر کی اور سی۔ آئی۔ ڈی آفس میں پاسپورٹ کا اندراج کرایا۔ ہندوستان اور پاکستان شاید دنیا کے منفرد ممالک ہیں جہاں ملک کا ویزا دینے کی بجائے شہروں کا ویزا دیا جاتا ہے۔ ایک شخص کو تین شہروں سے زیادہ ویزا نہیں دیا جاتا اور شہر میں آمد اور روانگی کا سی آئی۔ ڈی آفس میں اندراج ضروری ہوتا ہے۔ شام کو ڈاکٹر صاحب مولانا محمد منظور نعمانی صاحب سے ملاقات کرنے تشریف لے گئے۔ رات کا کھانا مولانا محترم کے ساتھ تناول فرمایا اور مفید گفتگو کی ۔

مولانا ابوالحسن علی ندوی صاحب کو ڈاکٹر صاحب کے بھارت آنے کی خبر مل چکی تھی اور وہ لکھنؤ میں ڈاکٹر صاحب سے ملاقات کے لئے ٹھہرے ہوئے تھے۔ لیکن جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے علی گڈھ یونیورسٹی کے کینیڈی ہال کے جلسہ کی وجہ سے ایک دن کی تاخیر ہو گئی۔ مولانا علی میاں کو رائے بریلی جانا ضروری تھا اس وجہ سے وہ لکھنؤ سے تشریف لے جا چکے تھے ۱۲ر کی صبح ڈاکٹر صاحب مولانا علی میاں سے ملاقات کے لئے رائے بریلی تشریف لے گئے۔ ندوہ کے ناظم جناب مولانا معین اللہ صاحب ندوی بھی اس سفر میں ہمراہ تھے، جنھوں نے کار کا انتظام کیا تھا۔ مولانا ندوی کے علاوہ اس سفر میں ڈاکٹر اشتیاق احمد قریشی بھی ساتھ تھے۔ ڈاکٹر قریشی صاحب لکھنؤ کے مشہور ہومیو پیتھک معالج ہیں۔ دردمند دل رکھتے ہیں اور انہیں ملی و سیاسی امور میں مولانا علی میاں کے مشیر و معاون کی حیثیت حاصل ہے۔ رائے بریلی لکھنؤ سے پچاس میل دور ہے ۔

رائے بریلی پہنچ کر ڈاکٹر صاحب نے مولانا علی میاں سے ملاقات کی، پرانے اور نئے امور پر سیر حاصل گفتگو کی۔ مولانا افتخار احمد فریدی صاحب مراد آباد سے آئے ہوئے

تھے، ان سے بھی یہیں پر ملاقات اور تفصیلی گفتگو ہوگئی۔ حالانکہ ڈاکٹر صاحب کی خواہش اُن سے ملاقات کے لئے مُراد آباد جانے کی تھی۔ مولانا علی میاں نے بہت ہی شفقت اور محبت کا مظاہرہ کیا۔ کوئی بیس گھنٹے اُن کی معیت میں گذرے ؛

رائے بریلی سے قریب کوئی ایک ڈیڑھ فرلانگ دُور تکیہ شاہ علم اللہ ہے جو دریائے سئی کے کنارے ہے، ڈاکٹر صاحب وہاں تشریف لے گئے۔ بفضلہ تعالیٰ پانچ نمازیں یہیں پڑھیں، قبروں پہ فاتحہ پڑھی۔ شاہ علم اللہ صاحب نے جو سید احمد شہیدؒ کے اجداد میں سے تھے، یہاں پہ خانقاہ تعمیر کی تھی۔ تین سو برس قبل یہاں جو مسجد تعمیر کی تھی وہ ابھی تک اسی نقشہ پر موجود ہے۔ اس جگہ کو یہ اعزاز بھی حاصل ہے کہ سید احمد شہیدؒ نے بیعتِ جہاد کے بعد یہیں سے سفرِ ہجرت کا آغاز کیا تھا۔ یہیں سے وہ فرزانے اٹھے تھے جو بالاکوٹ کے میدان میں جہاد کرتے ہوئے خاک و خون میں نہائے ؎

بنا کردند خوش رسمے بخاک و خون غلطیدن ؛ خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

۱۳ فروری کو ناشتہ کے بعد مولانا علی میاں صاحب کے ہمراہ ڈاکٹر صاحب تنہا سیر کو نکلے۔ بعض باتیں رہ گئی تھیں۔ اس سیر کے دوران ڈاکٹر صاحب نے اُن سے تسلی بخش حد تک گفتگو کی ؛

ساڑھے دس بجے تک واپس لکھنؤ پہنچ گئے، سیدھے ندوہ اپنی قیام گاہ پہنچے۔ دوپہر کا کھانا اساتذہ کے ساتھ کھایا۔ اساتذہ ڈاکٹر صاحب کے خطاب کے خواہش مند تھے لیکن ان دنوں طلباء کے امتحانات ہو رہے تھے، اس لئے خطاب نہ ہو سکا۔ تھوڑے سے وقت میں تیزی کے ساتھ ڈاکٹر صاحب نے قابلِ دید مقامات کا ایک چکر لگایا۔ اصغر علی محمد علی کا حنظر کا کارخانہ بھی دیکھا اور وہاں سے عطر خریدا۔ انہی کے زیرِ اہتمام چلنے والے مدرسہ فرقانیہ کا بھی معائنہ فرمایا۔ اس دوران ڈاکٹر اشتیاق احمد قریشی صاحب ہمراہ تھے۔ سی۔ آئی۔ ڈی آفس جاکر لکھنؤ سے واپسی کا اندراج کرایا ؛

شام کو چار بجے مولانا منظور احمد صاحب نعمانی کے ساتھ وقت طے تھا۔ وہاں پہنچ کر ڈاکٹر صاحب نے مولانا محترم کے ساتھ سیر حاصل گفتگو کی۔ عالمِ اسلام کو درپیش دینی سیاسی، ثقافتی اور تہذیبی مسائل زیرِ بحث آئے۔ جماعتِ اسلامی کے ماضی اور حال کے سلسلے میں گفتگو ہوئی اور مستقبل کے اندیشوں پر بھی تبادلۂ خیال ہوا۔ مولانا نعمانی صاحب سے ملاقات کر کے ڈاکٹر صاحب دلی جانے کے لئے سیدھے اسٹیشن روانہ ہو گئے۔

لکھنؤ کا چار باغ کا ریلوے اسٹیشن برِ صغیر کے مشہور ترین اور خوبصورت ترین اسٹیشنوں میں سے ایک ہے۔ ڈاکٹر اشتیاق احمد صاحب یہاں بھی ساتھ تھے۔ لکھنؤ میل میں ڈاکٹر صاحب کے لئے سیٹ ریزرو تھی جس سے وہ براستہ مُرادآباد، بریلیؔ دہلی کے لئے روانہ

دھلی میں چار دن ڈاکٹر صاحب ۱۴ فروری کو صبح آٹھ بجے دہلی پہنچے مولانا وحید الدّین خان صاحب نے ایک خط میں اپنے ہاں قیام کی دعوت دی تھی۔ چنانچہ ان کے صاحبزادے ثانی اثنین سلّمہ اسٹیشن پر ڈاکٹر صاحب کے استقبال کے لئے موجود تھے۔ ان کا فلیٹ گلی قاسم جان میں الجمعیّت بلڈنگ میں واقع ہے۔ نہا دھو کر اور ناشتہ کر کے ڈاکٹر صاحب نے ثانی اثنین صاحب کے ساتھ دور کے ایک ننھیال کے عزیز حافظ محمّد عرفان صاحب کے مکان پر حاضری دی۔ یہاں سے جماعت اسلامی ہند کے مرکز تشریف لے گئے جہاں پر قیّم جماعتِ اسلامی ہند جناب افضل حسین صاحب نے آپ کا نہایت خندہ پیشانی کے ساتھ استقبال کیا۔ انہوں نے نہ صرف یہ کہ غیریّت کا کوئی احساس نہ ہونے دیا بلکہ یہ پیشکش کی اور اس پر اصرار بھی کیا کہ ڈاکٹر صاحب جماعت کے مہمان خانہ میں قیام فرمائیں۔ ڈاکٹر صاحب نے ان کی پیشکش پر شکریہ ادا کیا۔ افضل حسین صاحب نے دوسرے روز بعد نمازِ عصر مرکز جماعت میں ڈاکٹر صاحب کو درسِ قرآن اور بعد نمازِ عشاء کھانے کی دعوت دی، جسے انہوں نے قبول فرمالیا ؂

دوپہر کو تبلیغی جماعت کے مرکز نظام الدّین تشریف لے گئے۔ جماعت کے امیر مولانا انعام الحسن صاحب جو آج ہی بنگلہ دیش کے دورہ سے واپس تشریف لائے تھے اس وقت آرام کر رہے تھے اس دوران ڈاکٹر صاحب نے مولانا عبید اللہ بلیاوی سے ملاقات کی جو نہایت محبّت اور شفقت سے ملے اور اعزاز و اکرام سے پیش آئے۔ وہاں ایک صاحب نے یاد دلادیا کہ سی آئی۔ ڈی آفس میں دہلی آنے کا اندراج کرایا ہے کہ نہیں؟۔ چنانچہ ڈاکٹر صاحب واپس مولانا وحید الدّین صاحب کے مکان پر گئے، پاسپورٹ لیا اور سی۔ آئی۔ ڈی آفس میں اندراج کرایا۔ سی۔ آئی۔ ڈی آفس کے متّصل ہی مسجد عبدالنّبی ہے جہاں جمعیّتہ العلماءِ ہند کا مرکزی دفتر واقع ہے۔ اس مسجد پر ہندوؤں نے قبضہ کر لیا تھا۔ مولانا حفظ الرّحمٰنؒ صاحب نے بڑے ہی مجاہدانہ انداز میں اسے واگذار کرایا تھا جمعیّت کے دفتر میں ڈاکٹر صاحب تشریف لے گئے، جہاں جمعیّت کے ناظم مولانا فضیل صاحب سے ملاقات ہوئی۔ معلوم ہوا کہ صدر جمعیّت مولانا اسعد مدنی صاحب بنگلہ دیش کے

دورہ پر گئے ہوئے ہیں۔ فضیل صاحب سے مفید تبادلۂ خیالات ہوا۔ انہوں نے ڈاکٹر صاحب کو اگلے روز دوپہر کے کھانے پر مدعو کیا۔ یہاں سے ڈاکٹر صاحب دوبارہ تبلیغی جماعت کے مرکز نظام الدین تشریف لے گئے۔ مولانا انعام الحسن صاحب سے ملاقات ہوئی انہوں نے اکرام فرمایا اور مدینہ منورہ کی کھجوریں ہدیۃً پیش کیں۔ عشاء کے بعد قیام گاہ پر واپسی ہوئی

۱۵ر فروری بروز جمعہ صبح مولانا وحید الدین خان صاحب سے تفصیلی گفتگو ہوئی۔ جمعہ کی تیاری کرنے کے بعد سائیکل رکشہ میں ڈاکٹر صاحب تنہا اس مکان کو دیکھنے نکلے جس میں تقسیم سے قبل ان کے ماموں صغیر احمد جان صاحب صغیر مرحوم مقیم تھے۔ ۱۹۴۰ء میں یہیں پر نانا کا انتقال ہوا تھا، مکان جوں کا توں تھا۔ سفیدی اور رنگ وروغن ختم ہو چکا تھا۔ جمعہ کی نماز مشہور زمانہ جامع مسجد میں ادا کی۔ شاہی امام عبداللہ بخاری صاحب دورے پر تھے، اس لئے نماز ان کے صاحبزادے نے پڑھائی، ان کی قرأت بہت اچھی تھی۔ نماز جمعہ سے قبل ڈاکٹر صاحب ندوۃ المصنفین تشریف لے گئے جہاں مفتی عتیق الرحمٰن صاحب مدظلہ سے ملاقات ہوئی، کچھ دیر تبادلۂ خیال ہوا۔ بعد نماز جمعہ جمعیۃ العلماء ہند کے مرکز مولانا فضیل صاحب کی دعوت پر تشریف لے گئے۔ دوپہر کا کھانا یہیں تناول فرمایا۔ یہیں پر ایک سردار جی سے ملاقات ہوئی جو قرآن مجید کا منظوم ترجمہ گورمکھی زبان میں کر رہے ہیں۔ سورۃ الفاتحہ اور سورۃ الرحمٰن کے پہلے رکوع کا ترجمہ سنا جو واقعی بہت عمدہ تھا۔

واپسی پر مولانا وحید الدین خان صاحب کے ہاں مختصر قیلولہ کیا اور پھر اُن کے ہمراہ جماعت اسلامی ہند کے مرکزی دفتر تشریف لے گئے، جہاں وہ درسِ قرآن حکیم کے لئے مدعو تھے۔ بعد عصر درسِ قرآن کا آغاز ہوا۔ ڈاکٹر صاحب نے عصر تا مغرب سورۂ صف اور مغرب تا عشاء سورۂ جمعہ کا اجمالی بیان فرمایا۔ آپ نے واضح فرمایا کہ نبی اکرم ﷺ کی بعثت کا اصل مقصد کیا تھا اور اس مقصد کے حصول کے لئے آپ نے کیا طریق کار اختیار فرمایا۔ حاضری پچاس ساٹھ کے لگ بھگ تھی۔ جس میں جماعت اسلامی مرکزی اسٹاف بشمول مولانا حامد علی صاحب، مولانا افضل حسین صاحب کے علاوہ جماعت کے بہت سے دیگر ارکان موجود تھے۔ امیر جماعت اسلامی مولانا محمد یوسف صاحب اور مولانا حامد حسین صاحب ایران کے دورہ سے واپس آنے کے بعد آج کل بمبئی اور پھر جنوبی ہند کے دورہ میں مصروف تھے۔ درسِ قرآن کے بعد حاضرین کے سوالات کے جوابات دیئے اور رات گئے واپسی ہوئی

۱۶ فروری بروز ہفتہ | ڈاکٹر صاحب کی جائے پیدائش حصار ہے جو دہلی سے تقریباً
سو میل دور ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنی ابتدائی زندگی کے پندرہ سال وہیں گزارے ۱۹۴۷ء
میں تقسیم کے ہنگاموں کے دوران ڈاکٹر صاحب ایک پیدل قافلہ کے ساتھ خونی دریا کو
پار کرتے ہوئے بیس دنوں میں پاکستان پہنچے۔ سلیمانکی ہیڈورکس آپ کا پہلا پڑاؤ تھا۔
اس کے بعد اب پہلی بار ہندوستان تشریف آوری ہوئی تھی۔ اس لئے فطری طور پر شدید خواہش
تھی کہ حصار کو دیکھا جائے۔ چنانچہ ثانی اثنین کے ہمراہ علی الصبح ہی روانہ ہوگئے اور بس
کے ذریعہ رہتک مہم اور ہانسی ہوتے ہوئے حصار پہنچے۔ حصار کی آبادی میں آٹھ گنا اضافہ
ہوچکا تھا۔ پہلے وہاں چار ہائی اسکول تھے، اب متعدد کالج اور ایک بڑی زرعی یونیورسٹی
ہے۔ حصار اسٹیشن سے متصل اس مکان کو دیکھا جہاں پیدائش ہوئی تھی اور دادا کا انتقال
ہوا تھا۔ وہ مکان بحمداللہ اُسی نقشہ پر قائم ہے اور پہلے سے بہت بہتر حالت میں ہے جس کے
ریلوے اسٹیشن کی سیر کی، یہ اسٹیشن کبھی بچپن میں ڈاکٹر صاحب کے کھیل کا میدان ہوتا
تھا۔ جس ہائی اسکول میں پانچ سال تک تعلیم حاصل کی تھی اُسے دیکھا وہ منہدم کر دیا گیا تھا
شاید اُس کی جگہ کوئی نئی تعمیر کی جا رہی ہو۔ مسجدیں بہت ابتر حالت میں ہیں، اکثر کو مندر
بنا لیا گیا ہے۔ پورے شہر میں کوئی مسلمان گھرانہ موجود نہیں ہے۔ ڈاکٹر صاحب کا وہاں
چلنا پھرنا عجیب نظروں سے دیکھا جا رہا تھا، بعض لڑکوں کی طرف سے کچھ فقرے بھی چُست
کیے گئے۔ بہرحال ڈاکٹر صاحب جلدی جلدی کچھ مقامات کو دیکھ کر، جو وہ دیکھنا چاہتے تھے۔
سورج گرہن کے وقت سے قبل ہی دہلی اپنی قیام گاہ پر واپس تشریف لے آئے۔ سورج
گرہن کے دوران پورے شہر میں ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کرفیو لگا ہوا ہو۔ یوں بھی ہندو
MYTHOLOGY میں سورج گرہن سے متعلق عجیب غریب باتیں ہیں، جن کی وجہ سے ہندو
بہت ہی زیادہ سہمے ہوئے تھے۔ واپس آنے پر معلوم ہوا کہ جامعہ ملّیہ سے رشید الوحیدی
صاحب تشریف لائے تھے۔ انہیں سخت افسوس تھا کہ جمعہ، ہفتہ اور اتوار جامعہ میں
چھٹی ہونے کی وجہ سے ڈاکٹر صاحب کے خطاب کا انتظام نہ کیا جا سکا۔ جامعہ ملّیہ سے فون
پر بھی ڈاکٹر صاحب سے رابطہ قائم کرنے کی کوشش کی گئی لیکن ڈاکٹر صاحب قیام گاہ
پر موجود نہ تھے۔ شام کو وحید الدین خان صاحب کے ساتھ تفصیلی ملاقات ہوئی۔

۱۷ فروری بروز اتوار | شعیب کوٹی صاحب سابق سیکرٹری مسلم مجلس مشاورت نے
کوچہ چیلاں کی مسجد خواجہ میر درد میں آج بعد نماز فجر ڈاکٹر صاحب کے درس قرآن

کا اہتمام کیا تھا۔ اس سلسلے میں ایک روز قبل روزنامہ "الجمعیۃ" اور روزنامہ "دعوت" میں اعلانات بھی شائع کئے گئے تھے۔ ڈاکٹر صاحب نے سورۂ حج کے آخری رکوع کا درس دیا جو بہت پسند کیا گیا۔ مولانا وحید الدین خان صاحب بہت ہی متاثر تھے۔ فرمانے لگے کہ ڈاکٹر صاحب! پاکستان میں آپ کے درس سمجھنے والے مشکل سے چند ہی افراد نکلیں گے۔ اُمید ہے کہ مولانا "قرآن کانفرنس" میں شرکت کے لئے تشریف لائیں گے۔ اُن کی خواہش ہے کہ وہ یہاں ہمارے کام کا بھی مشاہدہ فرمائیں۔

ڈاکٹر صاحب کانپور سے لکھنؤ تشریف لے گئے تھے لیکن میں کانپور ہی میں رہا۔ ۱۴ر فروری کو میں کانپور سے واپس علی گڈھ آیا۔ علی گڈھ اور کانپور کے قیام کے دوران تقریباً تیس۳۰ افراد کو ڈاکٹر صاحب کا مشہور کتابچہ "مسلمانوں پر قرآن مجید کے حقوق" ہدیہ کیا۔ علی گڈھ کے دوبارہ قیام کے دوران جماعتِ اسلامی ہند کے ادارۂ تصنیف وتالیف کے سربراہ جناب مولانا جلال الدین صاحب انصر عمری اور ان کے رفقاء سے ملاقات کی۔ ڈاکٹر یلگرامی، جناب عشرت علی قریشی صاحب، مولانا تقی امینی صاحب اور چند دیگر حضرات سے بھی ملاقات کی گئی۔ مولانا سعید احمد صاحب اکبر آبادی کے مکان پر حاضری دی لیکن ان سے ملاقات نہ ہوسکی۔ ۱۷ر فروری کی صبح ایرانڈیا ایکسپریس سے دہلی روانہ ہوا، جہاں ایک بجے دوپہر پہنچا۔ اہلیہ اور بچی ساتھ تھے۔ قاضی عبدالخالق صاحب، ان کی اہلیہ (یعنی راقم کی بہن) اور چند دیگر احباب دہلی تک چھوڑنے آئے ہوئے تھے۔ ہم سب لوگ ڈاکٹر صاحب کی قیام گاہ پر پہنچ گئے اور مولانا وحید الدین خان صاحب کے مہمان رہے۔ دوپہر اور رات کا کھانا اُن کے ہاں کھایا۔ مولانا ہمارے ساتھ بہت ہی محبت اور شفقت سے پیش آئے۔ وہ ایسے آدمی ہیں کہ واقعی اُن سے محبت کرنے کو جی چاہتا ہے۔ تمام کو ڈاکٹر صاحب کے ہمراہ جامع مسجد ہوتے ہوئے جماعتِ اسلامی ہند کے دفتر گئے۔ مولانا افضل حسین صاحب بہت ہی محبت سے پیش آئے۔ جماعت کے حلقہ یوپی کے رہنما جناب محمد شفیع صاحب مونس بھی موجود تھے۔ چائے وغیرہ سے تواضع کی اور مغرب تک تبادلۂ خیال جاری رہا۔ بعد مغرب قیام گاہ پر واپس آکر اور کھانا کھاکر امرتسر جانے کے لئے دہلی کے اسٹیشن پہنچے۔ فرنٹیئر میل میں برتھ ریزرو تھیں۔ سوا نو بجے فرنٹیئر میل روانہ ہوئی اور صبح سات بج کر بیس منٹ پر یعنی صرف پانچ منٹ تاخیر سے امرتسر کے اسٹیشن پر پہنچے۔ اٹاری کے لئے ٹیکسی کرائے پر لی، ایک مسلمان کے ہوٹل پر ناشتہ کیا۔ بھارت اور پاکستان کی

جانب اٹاری اور واہگہ پر کسٹم وغیرہ کے مراحل سے فارغ ہو کر ٹیکسی پکڑی اور پیر ۱۸ر فروری کو گیارہ بج کر پانچ منٹ پر واپس قرآن اکیڈمی پہنچ گئے۔ یعنی ۳ر فروری کو گیارہ بج کر پانچ منٹ پر روانہ ہوئے تھے اور ۱۸ر فروری کو اسی وقت واپس پہنچ گئے ـــــ چند ماہ قبل ایک تبلیغی دورہ ڈاکٹر صاحب نے دیارِ مغرب کا کیا تھا جس میں امریکہ، کینیڈا اور مصر شامل تھے ـــــ اور دوسرا تبلیغی دورہ یہ مشرق کا ہو گیا اور الحمدللہ ثم الحمدللہ کہ دونوں دورے توقع سے کہیں زیادہ کامیاب رہے۔ اس کامیابی پر ہمارے سر اپنے ربّ کے حضور جھک گئے ہیں۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ دین کی راہ میں ہماری اس سعی کو قبول فرمائے اور ہمیں اس راہ میں مزید کام کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ اس لئے کہ دُنیا کے حالات تیزی کے ساتھ بدل رہے ہیں۔ چہار طرف ایک عظیم تغیّر برپا ہے اور کام کرنے کی جتنی ضرورت آج ہے اتنی ماضی قریب اور شاید ماضی بعید میں بھی پہلے کبھی نہ ہوئی ہو ؎ "اُٹھ کے اب بزمِ جہاں کا اور ہی انداز ہے
مشرق و مغرب میں تیرے دَور کا آغاز ہے!"

بقیّہ درسِ قرآن "سُورۃ العصر"

کرتے وقت نرمی ہو، نصیحت لٹھ مار نہ ہو۔ بڑی نرمی اور محبّت سے سمجھایا جائے، اور جب آپ نے نیکی کو آگے پھیلانے کا کام کیا تو اب اگر کوئی مخالفت کرتا ہے، طعنے دیتا ہے کہ بڑا مُلّا ہے آگیا نصیحت کرنے کے لئے، تو اُن کی باتوں پر صبر کرنا چاہیئے ۔ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ ۝ "وہ آپس میں تلقین کرتے ہیں صبر کی!"

یہ ہے سورۃ العصر کی تفسیر۔ اللہ تبارک و تعالیٰ ہمیں توفیق دے کہ صحیح معنوں میں قرآن مجید کو سمجھیں اور سمجھائیں اور اس پر عمل کریں اور اپنے تمام انفرادی و اجتماعی کاموں میں اسی کو حَکَم (جج) بنائیں۔ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ ۙ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ ۝ کی تفسیر وقت کی تنگی کی وجہ سے پوری تفصیل کے ساتھ نہیں پیش کی جا سکی۔ کسی دوسرے موقع پر پیش کی جائے گی۔ اِنْ شاء اللہ العزیز ـــــ !!

اَقُوْلُ قَوْلِیْ هٰذَا وَاَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ لِیْ وَلَكُمْ وَلِسَائِرِ الْمُسْلِمِیْنَ وَالْمُسْلِمَاتِ ۝
وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۝

ہندوستان سے ایک خط

شعبۂ علومِ اسلامیہ، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی
علی گڑھ ——— انڈیا

جنابِ من : سلام وتحیات !

مرکزی انجمن خدّام القرآن لاہور کی مجوّزہ ساتویں سالانہ قرآن کانفرنس لاہور میں شرکت کا دعوت نامہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر کے سیکرٹری اور ڈپٹی رجسٹرار جناب عبدالخالق قاضی کے توسّط سے ملا، جس کے لئے میں آپ کا انتہائی ممنون و مشکور ہوں۔

آپ کی یہ انجمن قرآن مجید کی حکیمانہ تعلیمات کی تشہیر و اشاعت کے کام کو جس خوبی، جذبۂ صادق اور اعلیٰ پیمانہ پر انجام دے رہی ہے اس کے لئے آپ میری اور مسلمانانِ ہند کی جانب سے لائقِ صد مبارک باد ہیں اور اس کارِ خیر کے لئے بارگاہِ ایزدی میں یقیناً اجرِ عظیم کے مستحق ہوں گے۔ اِنْ شاء اللہ تعالیٰ۔ ؛

علی گڑھ میں آپ کے مختصر قیام کے دوران آپ سے اپنی حاضری کے موقع پر جو بالمشافہ گفتگو ہوئی۔ میر ریڈ ٹیکلسٹ سوسائٹی کے اجتماع خاص اور کینیڈی ہال میں یونیورسٹی کے زیرِ اہتمام آپ کے خطابِ عام کے نقوش ابھی تک دل و دماغ پر مرتسم ہیں۔ آپ نے اپنے خطابِ عام میں "سیرتِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے انقلابی پہلو!" پر جس مُدلّل، دلنشیں اور علمی انداز سے روشنی ڈالی وہ میرے جیسے اسلامیات کے طالب علم کے لئے بڑی مفید اور متاثر کن تھی۔

ادھر آپ کی عنایت کی ہوئی چند تصانیف سے بھی استفادہ کر رہا ہوں۔ خدا آپ بزرگ و برتر ہم سب کی زندگی کو "صبغۃ اللہ" کی رنگینی عطا فرمائے، اور قرآن سے حقیقی معنوں میں علمی و عملی محاذ پر استفادہ کی توفیق بخشے، آمین ؛

آپ کی مجوزہ ساتویں سالانہ قرآن کانفرنس لاہور میں شرکت سے مجھے بے حد خوشی ہوگی۔ کیونکہ یہ میرے لئے بحیثیت مسلمان سعادت اور اسلامیات کے طالبِ علم کی حیثیت سے انتہائی فائدے کا باعث ہوگی۔ اس لئے میں اس موقع پر ضرور حاضری دوں گا۔ آپ سے گذارش ہے کہ آپ براہِ کرم مجھے جلد از جلد "اجلاس کے موضوعات اور دیگر تفاصیل" سے آگاہ فرمائیں عنایت ہوگی، تاکہ میں کانفرنس کے لئے اپنا مقالہ تیار کر سکوں ؛

اس سلسلے میں اگر کوئی خدمت میرے لائق یہاں کیلئے ہو تو ضرور مطلع فرمائیں مجھے خوشی ہوگی امید ہے کہ آپ مع اربابِ انجمن کے بخیر ہوں گے! والسّلام مع الاکرام : نیاز مند (ڈاکٹر) اختر الواسع

بخدمت جناب (ڈاکٹر) اسرار احمد صاحب صدر مؤسس مرکزی انجمن خُدّام القرآن ——— لاہور

یادرفتگاں

مولانا مودودی مرحوم کے بارے میں ڈاکٹر اسرار احمد

کا ایک انٹرویو

جو جناب فضل عظیم نمائندہ "قومی ڈائجسٹ" نے حاصل کیا!

سوال: آپ نے ۱۹۴۸ء سے جماعت اسلامی کے لئے سرگرمی سے کام کا آغاز کیا۔ ۱۹۵۰ء سے ۱۹۵۴ء تک اسلامی جمعیتِ طلبہ کے رکن بلکہ اسی زمانے میں ناظمِ اعلیٰ بھی رہے۔ آپ یہ فرمائیے کہ مولینا سیّد ابوالاعلیٰ مودودی سے آپ کب اور کیونکر متأثر ہوئے؟

جواب: مولینا مودودی سے میرا اوّلین تعارف تو اسی زمانے میں ہوگیا تھا، جب میں حصار میں گورنمنٹ ہائی سکول کا طالب علم تھا۔ ان دنوں میرا عملی تعلق تو مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن سے تھا، اور میں ضلع حصار کی مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کا جنرل سیکرٹری تھا، لیکن مولانا مودودی کے بھی کچھ کتابچے پڑھنے میں آئے۔ اور میں نے اپنے دل میں ان کی جانب کشش محسوس کی۔ میرے بڑے بھائی اظہار احمد صاحب ان دنوں میکلیگن کالج لاہور میں زیرِ تعلیم تھے۔ وہ جب چھٹیوں میں آتے تو میں انہیں مولانا مودودی کی کتب بڑے انہماک سے پڑھتے دیکھتا۔ یہی نہیں بلکہ وہ ان کتب کے مفصّل نوٹس بھی تیار کرتے۔ دوسری طرف میں اپنے سکول کے ماحول، سٹوڈنٹس فیڈریشن اور مسلم لیگ کے حلقوں میں یہ دیکھتا کہ مولانا مودودی کو بڑی تیز و تند تنقید کا ہدف بنایا جاتا ہے۔ یہ ۴۷-۱۹۴۶ء کا زمانہ تھا۔ جو کچھ میں اب عرض کرنے لگا ہوں وہ کچھ اچھا تو نہیں لگتا، لیکن اس دور کے حالات کے بیان کے سلسلے میں ناگزیر ہے کہ میرے ایک ساتھی مولانا کو مودودی کے بجائے مردودی کہا کرتے تھے۔ اس پر میری ان سے جھڑپ ہو جاتی تھی۔ اگرچہ میں عملاً مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن سے وابستہ تھا، اور تحریکِ پاکستان کے لئے اپنی بساط کے مطابق کام کر رہا تھا، لیکن میں مولانا مودودی کا دفاع کیا کرتا

تھا۔ ۱۹۴۷ء میں جب ہندوستان میں بالعموم اور مشرقی پنجاب میں بالخصوص مسلمانوں کے قتل عام کا سلسلہ شروع ہوا تو میں میٹرک کا امتحان دے چکا تھا۔ بلکہ ۱۲ر جولائی ۱۹۴۷ء کو میرا نتیجہ بھی نکل آیا تھا۔ ہمارے ہاں عید الفطر کے فوراً بعد ہندوؤں کے حملے شروع ہوئے، اور تقریباً ڈیڑھ ماہ ہم نے حصار میں محصور ہو کر بسر کئے۔ بھائی جان انجینئرنگ کے سالِ آخر کا امتحان دے کر واپس آ چکے تھے۔ ان دنوں ہم دونوں نے مشترکہ طور پر مولانا مودودی کی تفسیر تفہیم القرآن کی کچھ اقساط کا مطالعہ کیا جو "ترجمان القرآن" میں شائع ہوئی تھیں۔ اگرچہ بھائی جان عمر میں بھی مجھ سے بڑے تھے اور تعلیم میں بھی مجھ سے آگے تھے۔ لیکن عربی زبان پر مجھے اُن کی نسبت زیادہ دسترس حاصل تھی کیونکہ میں نے میٹرک میں عربی زبان کا مضمون لے رکھا تھا اور مجھے اس سے خاصا شغف تھا۔ ہم محلّے کی مسجد میں بیٹھ جاتے اور اکٹھے مل کر تفہیم کا مطالعہ کرتے۔

قرآن مجید سے میرا پہلا علمی تعارف تفہیم القرآن کی اقساط سے ہوا۔ مجھے اب بھی یاد ہے کہ اُن دنوں اِن میں سورۂ یوسف کی تفسیر شائع ہو رہی تھی، پاکستان آنے پر میں نے گورنمنٹ کالج لاہور میں ایف۔ایس۔سی میں داخلہ لیا۔ ان دنوں میرا قیام کرشن نگر میں اپنے ایک عزیز کے ہاں تھا۔ اس محلّے میں ایک حلقہ ہمدردانِ جماعتِ اسلامی قائم ہوا۔ اس حلقے کے قیام میں میں نے بڑھ چڑھ حصّہ لیا۔ اب جماعت اسلامی اور مسلم لیگ میں قبل از تقسیم ملک کا تضاد اگر کوئی تھا، تو ختم ہو چکا تھا۔ کیونکہ میرے ذہن میں تحریکِ پاکستان کا منطقی نتیجہ تو اسلامی نظام کا قیام تھا۔ اصولی طور پر دونوں میں مطمحِ نظر کا فرق مٹ چکا تھا۔

جب میں ایم۔بی۔بی۔ایس کے لئے میڈیکل کالج میں داخل ہوا تو ہاسٹل میں منتقل ہو گیا اور یہاں اسلامی جمعیتِ طلبہ سے میرا تعلق قائم ہوا۔ ان دنوں یہ چھوٹی سی تنظیم تھی، اور اس لئے مجھ جیسے ناکارہ لوگوں کو بھی شاید کچھ جلدی سے آگے بڑھنے کا موقع مل گیا۔ میں ایک سال تک میڈیکل کالج کی جمعیت کا ناظم رہا، اور دوسرے سال جمعیتِ لاہور اور جمعیتِ پنجاب کا ناظم بن گیا، اور پھر پوری جمعیت کا ناظم ہو گیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب مولانا مودودی سے میرا قریبی ربط رہا۔ ان سے اکثر ملاقاتیں رہتی تھیں۔ ایسا بھی ہوا کہ رات کے گیارہ بجے میں کسی مشورے کے لئے حاضر ہوا، اور مولانا کی خوابگاہ میں ملاقات ہوئی۔ مولانا بڑی شفقت فرماتے تھے۔ میں جب پنجاب کی جمعیت کا ناظم تھا تو میں نے جنوری یا فروری ۱۹۵۲ء میں برکت علی اسلامیہ ہال میں ایک تقریر کی جسے مولانا نے بہت پسند فرمایا تھا۔ یہ تقریر "ہم اور ہمارا

کام" کے عنوان سے اسلامی جمعیّت طلبہ کے دعوتی لٹریچر کا اب بھی ایک اہم حصّہ ہے۔ یوں روابط بڑھتے چلے گئے اور مولانا بھی مجھ پر زیادہ سے زیادہ شفقت فرمانے لگے۔ مولانا طلبہ کو بہت اہمیّت دیتے تھے۔ ان دنوں لاہور میں جمعیّت قائم تو تھی، لیکن فعّال نہ تھی یہ دعویٰ غلط نہ ہوگا کہ پنجاب میں بالعموم اور لاہور میں بالخصوص اسلامی جمعیّت طلبہ کا عوامی دَور شروع کرنے والا طالب علم مَیں ہی تھا۔ اگرچہ اس دور کا عوامی مرحلہ بہت محدود تھا۔ لیکن جمعیّت کو جمود کی کیفیت سے نکال کر فعالیّت کی طرف بڑھانے میں میری کوششوں کو زیادہ دخل تھا۔ میں یہ بھی عرض کردوں کہ مولانا مودودی کی تصانیف سے مجھے ایسا شغف ہوا کہ مَیں نے ان کا بغور مطالعہ کیا۔ اور مَیں نے بہت جلد مولانا کی تمام تصانیف پڑھ لیں۔ یہ شاید مناسبتِ ذہنی کی وجہ سے تھا کہ مَیں نے ان کتابوں کو ہضم کیا اور مولانا کے استدلال کا جو نہج تھا وہ بھی میرے ذہن نے محفوظ کر لیا۔ مولانا کی تحریروں میں بالخصوص ایک تحریکیّت تھی، اور دین کا ایک ہمہ گیر تصوّر، ایک انقلابی تصوّر تھا۔ اور انہی پہلوؤں کی طرف میں خصوصیّت سے متوجّہ ہوا۔ مَیں یہ کہہ سکتا ہوں کہ مَیں مولانا کی تصانیف کا حافظ ہوگیا۔ اس حد تک کہ جمعیّت یا ایسی ہی مختلف تقریبات میں اُن کے درس کی ذمّہ داری مجھ پر تھی۔ اجتماعی مطالعے کے ضمن میں تو مَیں یہ سمجھتا تھا اور دیگر لوگ بھی مجھے یہ تاثّر دیتے تھے کہ مَیں نے اِن کتابوں کو نہ صرف خود بھی سمجھ لیا، بلکہ مجھ میں دوسروں کو سمجھانے کی استعداد بھی پیدا ہوگئی ہے۔

س : اپنی تحریروں کے علاوہ مولانا نوجوان ذہن کی تربیت کیسے کرتے تھے، اور نوجوانوں کے اچھے کاموں کو کیسے سراہتے تھے، اور اُن کی غلطیوں پر کیسے سمجھاتے تھے، اور فہمائش کرتے تھے؟

ج : اصل میں اب یہ معاملات اتنے پرانے ہوگئے کہ مَیں اس سوال کا جواب زیادہ تفصیل سے نہیں دے سکتا۔ البتّہ یہ تاثّر سا ذہن میں اب تک محفوظ ہے کہ مولانا نوجوانوں سے انتہائی مشفقانہ انداز برتتے تھے۔ نوجوانوں کو خاص طور پر یہ احساس ہوتا تھا کہ مولانا اپنے اور نوجوانوں کے درمیان زیادہ فاصلہ نہیں رہنے دیتے۔ نوجوان بڑی آزادی کے ساتھ جو چاہتے سوال کرتے اور ان محفلوں میں ہلکی پھلکی گفتگو (LIGHT TALK) کا عنصر بھی شامل ہوتا تھا۔ نوجوان کوئی ثقالت یا بوجھل پن محسوس نہ کرتے تھے۔ مَیں نے دو مرتبہ اسلامی جمعیّت طلبہ کے تحت تربیت گاہیں منعقد کیں، اور دونوں مرتبہ میں ہی ان کا ناظم تھا۔ ان میں مولانا مودودی نے

ہمیں حدیث کا درس دیا تھا۔ درس کے دوران اور اس کے علاوہ بھی شام کے اوقات میں حصولِ معلومات کے لئے سوال و جواب ہوتے تھے۔ ماحول میں گھٹن کا مطلق احساس نہ ہوتا تھا۔ نوجوان کھل کر بات کرتے تھے۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ مولانا زیادہ فراخدلی کے ساتھ نوجوانوں کی تعریف نہ کرتے تھے۔ تحسین فرماتے تو نپے تلے انداز میں۔ شاید اس میں احتیاط کا یہ پہلو ہو کہ کوئی نوجوان اپنے بارے میں کسی غلط فہمی، کسی زعم میں مبتلا نہ ہو جائے۔ جہاں تک فہمائش یا روکنے ٹوکنے کا تعلق ہے، مجھے یاد نہیں پڑتا کہ نوجوانوں نے مولانا کی روک ٹوک کو کبھی بُرا محسوس کیا ہو۔ اس کے برعکس ہمارے بعض دوسرے مربّیان اور مدرّسین کے معاملے میں یہ محسوس ہوتا تھا کہ وہ جب ناراض بھی ہوتے تو اُن کی ناراضگی حدِّ اعتدال سے تجاوز کر جاتی اور اگر تعریف پر آتے تو افراط سے کام لیتے۔ اس کے برعکس مولانا بہت میانہ روی اختیار کرتے تھے۔

س : نوجوان طلباء کے نزدیک مولانا کی نمایاں ترین صفت کون سی تھی؟

ج : اس سوال کے جواب میں، مَیں طلباء کی نمائندگی کرنے کا تو مدّعی نہیں ہو سکتا۔ البتہ مَیں اپنا نقطۂ نظر بیان کر سکتا ہوں۔ جیسا کہ مَیں نے پہلے بھی عرض کیا میرے نزدیک مولانا کی تحریروں کے ذریعے دین کی دعوت کا انقلابی پہلو، دین کا اجتماعی تصوّر سب سے زیادہ نمایاں ہو کر ہمارے سامنے آیا۔ جہاں تک دین کے انفرادی تصوّر اور ذاتی زہد و تقویٰ کا تعلق ہے تو یہ نہ صرف ہمارے معاشرے میں پہلے بھی موجود تھا۔ بلکہ جہاں تک افراد کا تعلق ہے، ہمارے ہاں بہت اعلیٰ نمونے پہلے ہی پائے جاتے تھے۔ آج تو اس طرح کے نمونوں کو دیکھنے کے لئے آنکھیں ترستی ہیں۔ مولانا مودودی نے جو بات پیش کی وہ ایک اجتماعی تصوّر تھا کہ دین اپنا غلبہ چاہتا ہے۔ اور دین پوری زندگی پر غلبہ حاصل نہ کرے، اُس وقت تک منشائے خداوندی پورا نہ ہوگا۔ اور اس مقصد کے لئے ایک منظّم جدّوجہد کی ضرورت ہے۔ اسے آپ تحریک، دعوت یا دعوتِ اسلامی سے بھی تعبیر کر سکتے ہیں۔ بہرحال یہ وہ پہلو تھا جو ہمارے خیال میں کافی عرصے تک اوجھل رہا تھا۔ اور اس بات کو ایک طویل عرصہ کے بعد پوری وضاحت کے ساتھ مولانا مودودی نے پیش کیا۔ یہی نہیں بلکہ اس کے لئے انہوں نے عملی جدّوجہد اور ایک منظّم کوشش کا آغاز کیا۔ میرے نزدیک، اور مَیں سمجھتا ہوں اس وقت کے نوجوان طلباء کے نزدیک مولانا کی شخصیت کا یہی نمایاں ترین پہلو تھا۔

س : جن دنوں مولانا ملتان جیل میں نظر بند تھے، آپ کی ان سے ملاقات ہوئی تھی، اس ملاقات میں مولانا سے آپ کی کیا گفتگو ہوئی ؟

ج : یہ قدرے تفصیل طلب سوال ہے۔ میں نے اپنی تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد جب جماعت کی باقاعدہ رکنیت اختیار کی تو اس سے کچھ پہلے ہی، طالب علمی کے آخری ایام میں کچھ اس طرح کا سوال ہمارے سامنے آیا کہ یہ طریق کار جس پر جماعتِ اسلامی عمل پیرا ہے، صحیح اور نتیجہ خیز بھی ہے یا اس پر نظر ثانی کی ضرورت ہے۔ جماعتِ اسلامی نے پاکستان میں اپنی جدوجہد کو ابتداءً دو چیزوں پر مرتکز کیا تھا۔ ایک یہ کہ اس ملک کا دستور اسلامی خطوط پر بنے تاکہ پاکستان ابتداء ہی سے کم از کم فکری خطوط پر اسلامی ریاست دکھائی دے اور لادینی ریاست کی صورت اختیار نہ کر پائے۔ دوسرے یہ کوشش کی جائے کہ یہاں اقتدار پر ایسے لوگ فائز ہوں، جو نہ صرف دین کے قیام کے دعویدار ہوں بلکہ اس کے لئے دل سے خواہش مند بھی ہوں اور پھر یہ بھی ہو کہ وہ ضروری صلاحیتوں سے بہرہ ور بھی ہوں۔ جہاں تک پہلی کوشش کا تعلق ہے، اگرچہ اس کے لئے طویل جدوجہد اور مطالبات سب کچھ ہوتا رہا لیکن سات سال کی محنت کا نتیجہ بھی سامنے نہیں آ رہا تھا۔ ساتھ ہی یہ ہوا کہ جماعتِ اسلامی نے ۱۹۵۱ء میں پنجاب کے انتخابات میں حصہ لیا، تو اس کا نتیجہ بھی مایوس کن نکلا۔ ظاہر ہے کہ لوگوں نے یہ بات سوچنا شروع کی کہ آیا ہماری بنیادی اپروچ میں کوئی خرابی تو نہیں اور آیا جس پالیسی پر ہم گامزن ہیں، اس پر نظر ثانی کی ضرورت نہیں۔ اس ضمن میں میرے پیشِ نظر وہ سوال بھی تھا جو کسی صاحب نے مولانا سے کیا تھا، اور مولانا کا وہ باقاعدہ جواب بھی تھا جو "ترجمان القرآن" میں چھپا تھا۔

اس کا پس منظر یہ ہے کہ تحریک پاکستان میں مولانا نے اور جماعت اسلامی نے حصہ نہیں لیا تھا۔ اس وقت ان کا موقف یہ تھا کہ جب تک نیچے سے معاشرے کی اصلاح کا عمل جاری نہ ہو، اوپر کی سطح پر تبدیلی رُونما نہیں ہو سکتی۔ اور اگر اسلامی انقلاب لانے کے لئے اس کے علاوہ کوئی اور طریقہ استعمال کیا گیا تو وہ بار آور نہ ہوگا۔ اب یہاں آ کر کچھ یوں محسوس ہوا کہ نیچے کی سطح سے تبدیلی کی بجائے اوپر کی سطح سے تبدیلی کا مختصر اور آسان نسخہ (شارٹ کٹ) بروئے کار لایا جا رہا ہے۔ اس لئے ملتان جیل میں مولانا سے جب میں نے ملاقات کی تو اُس وقت یہ مسئلہ بڑی شدت کے ساتھ میرے ذہن میں تھا۔ میں نے اس پر بہت

سوچا تھا، اور میری خواہش تھی کہ میں اس مسئلے پہ مولانا سے مفصّل تبادلۂ خیال کر لوں۔ تاہم میں ایسا نہ کر پایا، کیونکہ ایک تو ملاقات کے لئے وقت مختصر سا تھا، اور دوسرے مولینا سے ملاقات کرنے والے اور بھی ساتھی تھے۔ اندریں حالات میں مولانا سے صرف ایک سوال کر پایا کہ "مولانا قیامِ پاکستان کے بعد آپ نے یہاں اسلامی انقلاب لانے کا جو طریقہ اختیار کیا ہے، آیا آپ اس پہ اب بھی عمل پیرا رہنے کا فیصلہ کئے ہوئے ہیں، یا کچھ نظرِ ثانی کر کے تقسیمِ ملک سے پہلے کے طریقِ کار کی طرف رجوع کرنا چاہتے ہیں"۔ مولانا کا جواب بہت مختصر تھا۔ کہ "میں ابھی موجودہ طریقِ کار کے لئے دروازے بند نہیں پا رہا"۔ اس سے ایک تو یہ بات سامنے آئی کہ خود مولانا کو ان دو جُداگانہ طریقِ کار کا اعتراف تھا۔ دوسرے یہ کہ مولانا نئے طریقِ کار کے بارے میں کچھ زیادہ پُرامید نہ تھے اگرچہ وہ اس سے ابھی قطعی مایوس بھی نہ ہوئے تھے۔ میں نے اپنے سوال کے اس مختصر جواب پر ہی اکتفا کیا۔ اس سے زیادہ دلیل اور حُجّت کا نہ اس مختصر ملاقات میں موقع تھا اور نہ ضرورت اور نہ ہی میرا یہ مقام تھا کہ اس سے زیادہ بحث کر سکتا۔

س : ۱۹۵۳ء میں مولانا کو فوجی عدالت نے پھانسی کی سزا سنائی تھی۔ اُس وقت آپ اسلامی جمعیّۃ الطلبہ کے ناظمِ اعلیٰ تھے، پھانسی کی سزا کی خبر سن کر آپ کے کیا تأثرات تھے؟

ج : تأثرات کا اندازہ تو آپ خوب لگا سکتے ہیں، اس لئے کہ ۱۹۵۳ء میں ابھی میرا وہ اختلافی ذہن نہیں بنا تھا، جس کا میں نے اس سے پہلے سوال کے جواب میں ذکر کیا ہے۔ ان دنوں جماعت اور تحریک نئے طریقِ کار پر شدّت اور یکسوئی کے ساتھ سرگرمِ عمل تھی۔ ہماری نگاہوں میں مولانا مودودی کا جو مقام اور مرتبہ تھا اسے اس پس منظر میں بخوبی سمجھا جا سکتا ہے۔ ایک داعیٔ حق، داعیٔ دین اور خادمِ رسول اللہ کو پھانسی کی سزا دینے پر جس قسم کے جذبات ہو سکتے ہیں، وہی میرے جذبات تھے۔ میں اسلامی جمعیّت طلبہ کا فعّال کارکن تھا اور جمعیّت کے زیرِ اہتمام ہم 'عزم' کے نام سے ایک ہفتہ وار یا شاید پندرہ روزہ پرچہ نکالتے تھے، میں اس پرچے کا مدیر بھی تھا۔ ان دنوں کے دو تین شمارے میرے احساسات کی پوری پوری ترجمانی کرتے ہیں۔ کیونکہ میں نے ہی ان شماروں کو مرتّب کیا تھا۔ مجھے اب بھی یاد ہے کہ ایک تو بڑے طمطراق کے ساتھ میں نے جگر مرادآبادی مرحوم کی یہ غزل شائع کی تھی ؎

یہ صحن و رَوِش یہ لالہ و گُل ہونے دو جو ویراں ہوتے ہیں
تخریبِ جُنوں کے پردے میں تعمیرِ گُلستاں ہوتے ہیں

بیدار عزائم ہوتے ہیں ، اسرار نمایاں ہوتے ہیں
جتنے وہ ستم فرماتے ہیں، سب عشق پہ احساں ہوتے ہیں
آسودۂ ساحل تو ہے مگر، شاید یہ تجھے معلوم نہیں
ساحل سے بھی موجیں اٹھتی ہیں، خاموش بھی طوفاں ہوتے ہیں!
یہ خون جو ہے مظلوموں کا ضائع تو نہ جائے گا لیکن
کتنے وہ مبارک قطرے ہیں جو صرفِ بہاراں ہوتے ہیں
جو حق کی خاطر جیتے ہیں، مرنے سے کہیں ڈرتے ہیں جگر
جب وقتِ شہادت آتا ہے دل سینوں میں رقصاں ہوتے ہیں

علاوہ ازیں رئیس امروہوی صاحب کا ایک قطعہ 'جنگ' میں شائع ہوا تھا، اُسے بھی میں نے 'عزم' میں بڑی آب و تاب کے ساتھ شائع کیا، لیکن اس تصرّف کے ساتھ کہ رئیس تخلص کے نیچے زیر لگا کر میں نے مفہوم حسبِ حال بنا دیا تھا۔ قطعہ یہ ہے ؎

وہ وقت آیا کہ ہم کو قدرت ہماری سعی و عمل کا پھل دے ÷ بتا رہی ہے یہ ظلمتِ شب کہ صبح نزدیک آ رہی ہے!
ابھی ہیں کچھ امتحان باقی، فلاکتوں کے نشان باقی ÷ قدم نہ پیچھے ہٹیں کہ قسمت ابھی ہمیں آزما رہی ہے!
رئیسِ اہلِ نظر سے کہہ دو کہ آزمائش سے جی نہ ہاریں ÷ جسے سمجھتے ہو آزمائش وہی تو بگڑی بنا رہی ہے!

س : ڈاکٹر صاحب! آپ نے اسلامی جمعیت طلبہ سے منسلک رہ کر کیا کھویا اور کیا پایا؟

ج : اسلامی جمعیت طلبہ سے منسلک ہو کر میں نے کھویا کچھ نہیں، پایا ہی پایا ہے۔ ویسے دُنیوی اعتبار سے کہا جائے تو بہت کچھ کھویا بھی، لیکن میں اسے کھونا نہیں پانا ہی پانا سمجھتا ہوں۔

س : یعنی اس زمانے میں آپ اپنی تعلیم پر زیادہ توجہ نہ دے سکے؟

ج : جی ہاں! جدید اکاؤنٹنگ (ACCOUNTING) دُہرے اصُول پر مبنی ہے، یعنی ہر کریڈٹ (CREDIT) کے مقابلے پہ ڈیبٹ (DEBIT) لازماً ہوتا ہے اگر اس پہلو سے دیکھا جائے تو میرے کھاتے میں ڈیبٹ ہی کا اندراج ہوا ہے۔ یعنی یہ کہ بحیثیت ڈاکٹر میرا کیریئر (CAREER) جتنا شاندار ہونا چاہیئے تھا، اتنا نہ ہو سکا۔ میں طالب علمی کے دور میں ذہین اور محنتی طلبہ کی صف میں شامل تھا۔ پرائمری جماعت میں مجھے وظیفہ ملا، مڈل

میں بھی مَیں نے وظیفہ حاصل کیا۔ میٹرک میں میری پوزیشن مشترکہ پنجاب میں چوتھی تھی۔ ایف ایس-سی میں بھی مَیں نے وظیفہ حاصل کیا۔ میڈیکل کالج کے سال اوّل میں، مَیں فرسٹ تھا۔ چنانچہ سیکنڈ ایئر میڈیکل کالج میں میرے پاس دو سکالرشپ تھے۔ ایک ایف۔ایس۔سی کی بنیاد پر اور دوسرا فرسٹ ایئر میڈیکل کالج کے امتحان کی بنیاد پر۔ اس کے بعد توجّہ منقسم ہو گئی، منقسم کا لفظ بھی صحیح نہیں ہوگا۔ یوں کہنا چاہیئے کہ میری ساری نہیں تو اکثر و بیشتر توجّہ تحریک اور دعوت پر مرتکز ہو کر رہ گئی۔ ماضی کی سو فیصد کے مقابلے میں اب تعلیم پر میری توجّہ فقط دس، پندرہ رہ گئی۔ نتیجہ ظاہر ہے، لیکن یہ اللہ کا فضل ہے کہ کسی امتحان میں ناکامی میرے تعلیمی ریکارڈ پر موجود نہیں۔ بہرحال ڈاکٹری کا پیشہ جس وابستگی اور توجّہ کا متقاضی تھا، وہ مَیں اُسے نہ دے سکا۔ چنانچہ یہ ڈیبٹ (DEBIT) اندراج تھا، لیکن مجھے اس پر کبھی افسوس نہیں ہوا۔ اس کے مقابلے پر کریڈٹ (CREDIT) کے خانے میں اندراج میرے نزدیک بہت زیادہ وقیع اور قابلِ قدر ہے۔ جمعیّت ہی کے زمانے میں مجھے دین کا وہ انقلابی تصوّر حاصل ہوا، جو میری زندگی کی عزیز ترین متاع ہے، اس کے لئے جدّوجُہد کرنے کا ایک گراں مایہ جذبہ ملا، جسے میں اب تک سینے سے لگائے ہوئے ہوں۔ علاوہ ازیں اس وابستگی کے باعث مَیں نے بولنے کا، تقریر کرنے کا فن سیکھا، ورنہ میں مشنریلے قسم کے طلباء میں سے تھا اور ایف۔ایس۔سی کی تکمیل تک مَیں نے تقریروں، ڈیبیٹس (DEBATES) وغیرہ میں کبھی حصّہ نہ لیا تھا۔ لیکن بعد میں اللہ تعالیٰ کے فضل سے مَیں نے بولنا بھی سیکھا۔ ۱۹۵۱ء میں جمعیّت کے سالانہ اجتماع کی صدارت مولانا امین احسن اصلاحی صاحب نے فرمائی تھی۔ یہ تقریب وائی۔ایم۔سی۔اے ہال میں منعقد ہوئی تھی۔ اس اجتماع میں، مَیں نے اپنی پہلی تقریر کی جس پر اصلاحی صاحب نے بہت تحسین آمیز تبصرہ فرمایا۔ جماعت کے حلقوں کو بھی میری اس تقریر پر خوشگوار حیرت ہوئی کہ ہمیں ایک نوجوان مقرّر میسّر آگیا ہے۔ 'عزم' کے حوالے سے مجھے قلم چلانے کی بھی مشق حاصل ہوئی۔ اگرچہ بعد میں مجھے بہت کم مواقع ملے اور میری یہ صلاحیّت پوری طرح پروان نہ چڑھ سکی۔ البتّہ یہ ضرور ہے کہ جب طبیعت کسی خیال کے اظہار کی طرف مائل ہوتی ہے تو مجھے قلم کے عجز کا احساس نہیں ہوتا۔ میں یہ محسوس نہیں کرتا کہ مجھے مافی الضّمیر کے اظہار پر قدرت حاصل نہیں۔ اب تو یہ حال ہے کہ لکھنا مجھے اتنا آسان معلوم نہیں ہوتا جتنا بولنا یا تقریر کرنا۔ مَیں سمجھتا ہوں کہ میری یہ صلاحیّتیں جمعیّت کے ساتھ منسلک رہنے کے باعث

ہی اُجاگر ہوئی ہیں ـــــ مختصر یہ کہ جمعیت سے تعلق کے باعث مجھے دین کا جو تصوّر ملا، جدّوجُہد کا جو جذبہ مجھ میں پیدا ہوا، اسے پیشِ نظر رکھتے ہوئے بندہ یہ کہہ سکتا ہے کہ معمولی سے معمولی خسارے کی نسبت مجھے مجموعی اعتبار سے بہت زیادہ فائدہ ہوا۔

س : مولانا کی نکتہ آفرینی اور حاضر جوابی سے ایک زمانہ واقف ہے، اِس ضمن میں اگر آپ کوئی دو، تین واقعات یاد ہوں تو براہِ کرم ہمیں بھی سُنا دیجئے!

ج : اس کے لئے ذہن پر زور دینا ہوگا، ویسے جمعیّت طلبہ کی تربیت گاہوں کے دوران تو اس قسم کے واقعات اکثر پیش آتے رہے۔ ہاں! مجھے یاد آیا، تربیت گاہ کا آخری دن تھا اور ہم نے اساتذہ کی دعوت کا اہتمام کیا تھا۔ مَیں نے مولانا مودودی سے گذارش کی، مولینا! کل کھانا ہمارے ساتھ کھائیے گا۔ جواب ملا، ٹھیک ہے، لیکن ساتھ ہی یہ بھی پوچھا: پھر مَیں بھی کچھ لے کر آؤں۔ مجھے کچھ ایسے ہی سوجھا اور مَیں بولا، مولانا! ہم مرغی پکا رہے ہیں۔ آپ کوئی مقابلے کی چیز لے کر آئیے۔ مولانا نے سوچ کر فرمایا کہ مرغی کے مقابلے کی چیز تو بٹیر ہے۔ اس پر محفل زعفران زار بن گئی۔

ایک مرتبہ ہم نے اُن سے کہا کہ مولانا! اپنے کچھ حالاتِ زندگی آکر بتائیے گا۔ اِس کے لئے ہم نے ایک باقاعدہ نشست رکھی تھی، اور مولانا نے بڑی فراخدلی سے اپنے حالاتِ زندگی بتائے بھی تھے۔ خیر ہمیں فوراً جواب ملا تھا۔ کیا آپ لوگ یہ چاہتے ہیں کہ مَیں اپنا مولود شریف خود پڑھوں۔

س : مولانا کے خالص علمی اور تحقیقی کام کے بارے میں آپ کی رائے؟

ج : جیسا کہ مَیں عرض کر چکا ہوں، میرے نزدیک مولانا کا اصل مقام ایک داعی کا ہے، تحقیق کا نہیں ہے۔ ہمارے ہاں کچھ غلط سا رواج ہو گیا ہے، کہ اگر کسی شخص سے محبّت ہو تو پھر جب تک اُس کے ہر پہلو کو کامل ثابت نہ کیا جائے، چین نہیں آتا۔ حالانکہ اگر کوئی شخص کسی ایک شعبے میں کوئی نمایاں کام سرانجام دے دے تو یہ بھی اُس کی عظمت کیلئے کافی ہوتا ہے۔ بدقسمتی سے ہمارے ہاں انسان کو یا تو مجموعی طور پر ٹھکرا دیا جاتا ہے، ـــــ WHOLE SALE CONDEMNATION ہوتی ہے، یا پھر اسے تمام صفات، تمام عظمتوں کا حامل قرار دیا جاتا ہے۔ لیکن آگے بڑھنے سے پہلے ایک چیز واضح کر دوں۔ آپ کو مخالفت اور اختلاف کے فرق کو پیشِ نظر رکھنا ہوگا۔ مَیں مولانا کا مخالف نہیں، البتّہ اختلاف کا حق تو مجھے

حاصل ہے۔ تو میرے نزدیک مودودی صاحب کا اصل مقام ایک داعیٔ دین کا ہے۔ مولانا کے تحقیقی کام کے متعلق میری اب جب کہ زمانۂ طالب علمی کی نسبت میرے ذہن میں پختگی پیدا ہوئی ہے — رائے یہ ہے کہ جہاں تک اعلیٰ فلسفیانہ سطح کا تعلق ہے، جس میں مابعد الطبیعیات اور اس سے متعلق اُمور بیان ہوتے ہیں اور جو علم کلام کا اصل موضوع ہے تو اس میدان میں مولانا مودودی صاحب نے قدم بھی نہیں رکھا۔ مولانا کی کتاب "جبر و قدر" درحقیقت ایک طرح سے صحافتی قسم کا —— مواد جمع کرنے کا انداز لئے ہوئے ہے۔ اسے تصنیف کی بجائے تالیف کہنا زیادہ بہتر ہوگا۔ اس میں کوئی فیصلہ کُن اور مُدلّل بات سامنے نہیں آتی۔ پھر یہ کہ اسلام کو نظامِ زندگی یا مکمّل ضابطۂ حیات ماننے والے سوشل تھنکر (SOCIAL THINKER) کی حیثیت سے مولانا مودودی کا ایک مقام ہے۔ انسانی زندگی کو اگر ہم تین شعبوں یعنی سیاسی، سماجی اور اقتصادی میں تقسیم کریں تو پھر معلوم ہوگا کہ مولانا نے سب سے زیادہ مطالعہ سیاسی شعبے یعنی اسلام کے سیاسی نظام کا کیا ہے، اور یہی ان کی تصانیف کا اصل اور اہم موضوع ہے۔ میری محدود معلومات کی حد تک دستور اور قانون کے موضوع پر کوئی اور مفکّر اور مصنّف ایسا نہیں جسے مولانا کے مقابل کھڑا کیا جا سکے۔ اسلام کے سماجی پہلو پہ بھی مولانا کو خاصی دسترس حاصل ہے اور اس پہلو پر مولانا نے اچھا مواد پیش کیا ہے۔ البتّہ یہ دسترس اس حد تک نہ تھی کہ اسے اسلام کے سیاسی نظام کی دسترس کا ہم پلّہ قرار دیا جا سکے۔ ذاتی طور پہ میرا خیال ہے اور اس سے ہر شخص کو بہرحال اختلاف کا حق حاصل ہے کہ معاشی معاملات کے ضمن میں مولانا کی سوچ اس حد تک آگے نہ بڑھ سکی، جس حد تک اُسے آگے بڑھنا چاہیئے تھا۔

ایک اور پہلو یہ ہے کہ مولانا چونکہ سائنس کے طالب علم کبھی نہ تھے۔ سائنسی موضوع پر اُن کی تحریروں میں تشنگی در آئی ہے۔ مثلاً اگر نظریۂ ارتقاء پر مولانا کچھ نہ لکھتے تو اور بات تھی۔ اور چونکہ انھوں نے لکھا ہے تو اسے فنی اعتبار سے مدلّل ہونا چاہیئے تھا۔ البتّہ ڈارون کے نظریۂ ارتقاء پر کچھ پیچیدگیاں انہوں نے ضرور کسی ہیں۔ علمی تحقیق کا تو اس میں رنگ ہے ہی نہیں لیکن یہ حقیقت بھی پیشِ نظر رہے کہ آج کل علم کا دائرہ اتنا وسیع ہو گیا ہے کہ ہمہ جہتی علم اب کسی شخص کے بس کی بات نہیں۔ علم کی شاخیں اب بہت پھیل چکی ہیں اور وہ دَور لد گیا جب ایک ہی شخص بیک وقت ریاضی دان، فلسفی، مُفسّر، متکلّم، منطقی، ہیئت دان

وغیرہ وغیرہ ہوتا تھا۔ چنانچہ اب یہ ضروری نہیں رہا کہ ایک شخص کو ہر صفت موصوف ثابت کرنے کی کوشش کی جائے۔

س : ۱۹۵۷ء میں جماعت سے علیحدگی کے بعد آپ نے مولانا سے کبھی ملاقات کی یا ملاقات کا کبھی ارادہ کیا؟

ج : ۱۹۵۷ء میں جب میں جماعت اسلامی سے مستعفی ہوا تو اس کے بعد تقریباً پانچ برس تک مولانا سے میری کوئی ملاقات نہیں ہوئی۔ مستعفی ہونے کے بعد جن دنوں میں ساہیوال (سابقہ منٹگمری) میں تھا، مولانا کسی سفر پر جا رہے تھے۔ ریلوے اسٹیشن پر اور بہت سے لوگوں کی طرح میں بھی گیا تھا۔ سرسری سی گفتگو کا موقع مل گیا تھا، لیکن میں اسے ملاقات قرار نہ دوں گا۔ البتہ مجھے ایک بات سن کر بڑی خوشی ہوئی کہ مولانا ایک بار منٹگمری آئے تو انہوں نے شیخ محمد آزاد صاحب کے ہاں قیام فرمایا تھا۔ شیخ صاحب اگرچہ جماعت کے رکن تو تھے نہیں، صالح نوجوان تھے۔ انہیں جماعت سے دلچسپی تھی۔ اس قیام کے دوران لوگوں نے مولانا سے کہا، مولانا! اس شہر میں جماعت بالکل مردہ سی تھی، ڈاکٹر اسرار احمد کے آنے پر اس میں کچھ حرکت پیدا ہوئی، جماعت کی ایک حیثیت بنی۔ اب وہ جماعت کو چھوڑ گئے ہیں اس پر مولانا کا جو تاثر مجھ تک پہنچا وہ یہ تھا کہ انہوں نے ٹھنڈی آہ بھر کر گہرے صدمے کے ساتھ فرمایا: "ہاں! مجھے بھی اُس سے اپنے بیٹوں کی طرح محبت ہے، بہرحال اختلاف ہونا تھا سو ہو گیا!"

میں اپنے والدین کے ہمراہ ۱۹۶۲ء میں پہلی بار حج بیت اللہ کی سعادت حاصل کرنے جا رہا تھا۔ دل میں شدت سے یہ جذبہ پیدا ہوا کہ مولانا سے ملاقات کر کے حج پر روانہ ہوں۔ چنانچہ میں مولانا کی خدمت میں لاہور حاضر ہوا اور عرض کی "مولانا! جہاں تک اختلاف کا تعلق ہے وہ تو اسی طرح قائم ہے۔ بلکہ میں اپنی سوچ پر پہلے سے بھی زیادہ شدت کے ساتھ قائم ہوں، البتہ میرے دل میں آپ کے لئے جو محبت اور ادب پہلے تھا، وہ روحانی طور پر اب بھی ہے۔ میں آپ کی خدمت میں اس لئے حاضر ہوا ہوں کہ آپ کے دل میں میرے متعلق کسی اعتبار سے بھی کوئی میل نہ رہے"۔ مولانا نے مجھے اطمینان دلاتے ہوئے فرمایا: "میرے دل میں تمہارے متعلق کوئی میل نہیں ہے"۔ اس کے بعد میں حج پر روانہ ہو گیا۔ اتفاق سے یہ وہی سال تھا جب سعودی عرب اور مصر کے مابین اختلافات نے اس حد تک شدت اختیار

کی کہ مصر سے ہر سال جو غلافِ کعبہ آیا کرتا تھا اور زیرِ بحث سال بھی آیا تھا، اسے سعودیوں نے قبول نہ کیا۔ جو مصری حج کی نیت سے احرام باندھ کر ایک مصری جہاز سے آئے تھے وہ حج کئے بغیر احتجاجاً واپس چلے گئے۔ اسی سال رابطہ عالمِ اسلامی کا تاسیسی اجلاس ہونا تھا۔ حج پر میری روانگی کے وقت تک تو مولانا کو اس اجلاس میں نہ شمولیت کا دعوت نامہ موصول ہوا تھا، اور نہ ہی اس کے کوئی آثار نظر آتے تھے۔ لیکن بعد میں دعوت نامہ موصول ہو گیا۔ مولانا کی آمد کا جب مجھے علم ہوا تو میں اُن کی خدمت میں حاضر ہوتا رہا۔ وہ سعودی عرب کے مہمان تھے۔ مجھے یاد ہے منیٰ میں جب میں حاضر ہوا تو مولانا اپنے خیمے سے باہر احرام باندھے بیٹھے تھے۔ انہی دنوں پاکستان میں کوئی انتخابات، غالباً بی۔ ڈی کے انتخابات ہوئے تھے۔ ان میں جماعت کو شدید ناکامی کا سامنا کرنا پڑا تھا، اور اس کی خبریں ابھی تازہ تازہ مولانا تک پہنچی تھیں۔ بعض اور وجوہات بھی تھیں مثلاً مدینہ یونیورسٹی کی جو سکیم لے کر گئے تھے، اسے عُلماءِ حجاز نے تقریباً کلّی طور پر رد کر دیا تھا۔ چنانچہ مولانا ایک صدمے کی سی کیفیت سے دوچار تھے۔ یہ دیکھ کر میں نے سوچا، لوہا گرم ہے، پھر کوشش کرنی چاہیئے۔ چنانچہ مدینہ منوّرہ میں جب میں مولانا کی خدمت میں حاضر ہوا تو میں نے ڈرتے ڈرتے وہی سوال کر دیا کہ مولانا! کیا آپ اب بھی یہ سوچنے پر آمادہ نہیں کہ موجودہ طریق کار نتیجہ خیز ثابت نہیں ہو رہا۔ میں نے اپنی زندگی میں پہلی بار مولانا کے جواب میں قدرے تلخی کا انداز دیکھا۔ انہوں نے فرمایا "یہی بات میں آپ لوگوں سے پوچھتا ہوں کہ کیا اب بھی آپ لوگ سمجھ نہیں پا رہے"۔ یہ جواب سُن کر میں نے محسوس کیا کہ اس موضوع پر مزید گفتگو بیکار ہے!

[آپ مناسب سمجھیں تو نقل کریں، نہ سمجھیں تو نہ کریں] ہوا یوں کہ ۱۹۶۲ء میں حج سے واپسی کے فوراً بعد جماعت نے دو ایسے اقدامات کئے جن کے باعث مجھے جماعت سے شدید نفرت پیدا ہو گئی۔ اور مولانا کے ساتھ دلی تعلّق کی پہلی سی کیفیت باقی نہ رہی۔ ایک اقدام کا تعلّق تو میرے نزدیک سیاسی میدان میں بے اُصولی کی انتہا تھا۔ یعنی صدر ایوب کے مقابلے پر حسین شہید سہروردی کے ساتھ اشتراک کیا گیا — حالانکہ موصوف جماعت کے نظریات اور اصولوں سے دُور، بلکہ بہت دُور تھے۔ دوسرے غلافِ کعبہ کی تشہیر مشرکانہ، اور اگر اسے آپ بہت سخت لفظ خیال کریں تو اوہام پرستانہ حرکت ضرور تھی۔ جماعت سے علیحدگی کے باوجود کم از کم پانچ سال تک محبّت کے جو جذبات میرے دل میں موجزن رہے، وہ ان دو واقعات

کی بنا پر ماند پڑ گئے۔

س : جب آخری دنوں آپ امریکہ میں تھے ..... ؟

ج : جی ہاں! مَیں بتاتا ہوں۔ جماعت کے مذکورہ بالا دو اقدامات کے بعد تو مولانا مودودی صاحب سے میری کوئی ملاقات نہیں ہوئی۔ البتہ موچی دروازہ کے باہر مَیں نے اُن کی ایک تقریر ضرور سُنی تھی۔ کچھ عرصے سے مجھ تک ایسی اطلاعات پہنچ رہی تھیں جن سے یوں محسوس ہوتا تھا، جیسے مولانا مودودی صاحب اب اس نتیجے پر پہنچ چکے ہیں کہ موجودہ طریق کار نتیجہ خیز نہیں ہوگا اور ہمیں سابقہ طریقِ کار کی طرف رجوع کرنا پڑے گا۔ لہٰذا میرے دل میں خواہش پیدا ہوئی کہ مَیں مولانا سے پھر ملاقات کروں۔ میرا خیال تھا کہ ملکی معاملات اور اپنی صحت کی کیفیت کے پیشِ نظر جماعت کی قیادت کو دوبارہ سنبھالنا مولانا کے لئے ممکن نہ ہوگا۔ لیکن اگر وہ اپنی موجودہ سوچ کو کھول کر لوگوں کے سامنے رکھ دیں تو اس طرح موجودہ قیادت کو رہنمائی مل جائے گی۔ جو جماعت کے اندر اُبھر رہی ہے، اور ہو سکتا ہے اس سے مفید نتائج برآمد ہوں۔ لیکن آپ جانتے ہیں کہ ہمارے ہاں اس طرح کی فضا ہے کہ ملنے ملانے سے طرح طرح کے خیالات اور افواہیں پھیلنا شروع ہو جاتی ہیں۔ چنانچہ خواہش کے باوجود مَیں ملاقات سے گریز ہی کرتا رہا۔ البتہ جب علاج کے سلسلے میں مولانا امریکہ گئے اور مجھے بھی ایک دعوت نامہ ملا، تو میرے دل میں ایک خیال پیدا ہوا کہ مولانا سے بفیلو میں ملاقات کی جائے۔ مَیں نے اپنے بعض احباب سے اس کا ذکر بھی کر دیا تھا۔ لیکن مشیّتِ الٰہی کو یہ منظور نہ تھا۔ مَیں ۳ ستمبر کو ٹورنٹو پہنچا اور بس اگلے روز مولانا کا اپریشن ہو گیا۔

میرے دوستوں نے ڈاکٹر احمد فاروق مودودی صاحب سے مسلسل رابطہ قائم رکھا اور ان سے میری ملاقات کے لئے وقت مانگتے رہے۔ ہمیشہ یہی اطلاع ملتی رہی کہ مولانا کی طبیعت ملاقات کے قابل نہیں، اور ڈاکٹروں نے شدید پابندی عاید کر رکھی ہے، کہ مولانا سے قریب ترین اعزّہ کے علاوہ اور کوئی نہ ملے۔ مَیں جب شکاگو جانے لگا تو مجھے بتایا گیا کہ مولانا کی طبیعت کچھ بہتر ہو گئی ہے اور دو، ایک روز بعد ملاقات ممکن ہو سکے گی۔ ابتدا میں میرا پروگرام شکاگو سے سیدھا نیویارک جانے اور وہاں سے وطن لوٹنے کا تھا۔ تازہ اطلاع ملنے پر مَیں نے اپنے پروگرام میں تبدیلی کی اور شکاگو سے ٹورنٹو واپسی کا ٹکٹ لیا کہ وہاں سے بفیلو بہت قریب پڑتا ہے۔ لیکن

شکاگو ہی میں اگلے دن مولانا کے انتقال کی خبر ملی۔ اگرچہ وقت بہت تنگ تھا لیکن اللہ کا بڑا فضل ہوا کہ ہوائی جہاز میں نشست مل گئی۔ چھ سات رفقاء کے ہمراہ میں بھی بفیلو پہنچ گیا اور نمازِ جنازہ میں شرکت کی۔ مجھے بتایا گیا کہ ایک جنازہ پہلے ہو چکا ہے۔ وہاں جو حالت میں نے دیکھی اس نے طبیعت پر ایک عجیب کیفیت طاری کی۔ کسی کو معلوم ہی نہ تھا کہ کیسی شخصیت اس جہان سے اٹھ گئی ہے۔ ؏

"مارا دیارِ غیر میں مجھ کو وطن سے دُور!"

میں سوچنے لگا۔ مولانا اگر اس وقت پاکستان میں ہوتے تو وہاں پر ایک قیامتِ صغریٰ برپا ہوئی ہوتی۔ امریکہ میں لاش گھر لانا، جوئے شیر لانے سے کم نہ تھا۔ یہ تو اللہ تعالیٰ کا فضل ہوا کہ ڈاکٹر احمد فاروق مودودی صاحب نے بہت ہمت سے کام لے کر کسی نہ کسی طرح اجازت حاصل کر لی۔ یہ اجازت بہت تھوڑی دیر کے لئے تھی۔ جب ہم پہنچے تو FUNERAL HOME - کے عملۂ تدفین کو میت لینے کے لئے آجانا چاہئے تھا۔ اللہ تعالیٰ کی کرم نوازی سے ان کے آنے میں دیر ہوگئی اور یوں مجھے نمازِ جنازہ پڑھانے کا موقع مل گیا۔ جو لوگ نمازِ جنازہ پہلے پڑھ چکے تھے، ان کی اکثریت بھی دوبارہ شریک ہوگئی۔ کُل نفری ہی کوئی ۳۴، ۳۵ افراد پر مشتمل ہوگی۔ اس کے بعد ہمارے سامنے ہی FUNERAL HOME والے مولانا کی میت لے کر چلے گئے۔ چنانچہ آخری ملاقات "زندہ مودودی" سے تو نہ ہو سکی اور دل کی حسرت دل ہی میں رہ گئی۔ تاہم میں اسے بھی اللہ کا فضل سمجھتا ہوں کہ نمازِ جنازہ نہ صرف پڑھائی، بلکہ اُن کا آخری دیدار بھی جی بھر کے اور بہت قریب سے کیا کہ وہاں کوئی ہجوم نہ تھا۔

س : ڈاکٹر صاحب! چند روز پہلے میں نے جب آپ سے انٹرویو کا ذکر کیا تو مجھے کچھ ڈر سا لگ رہا تھا۔

ج : کیوں؟

س : اس لئے کہ ۱۹۵۷ء میں جماعت سے الگ ہونے والے آپ کے ایک بزرگ ساتھی سے جب میں نے "خصوصی نمبر" کے لئے انٹرویو کی درخواست کی تو انہوں نے صاف انکار کر دیا تھا۔ آپ سے انٹرویو کے لئے جونہی بات کی، اور آپ نے جب بلا تأمل فرمایا: ہاں ہاں! ضرور ضرور! تو مجھے آپ کی عظمت کا ایک اور واقعہ یاد آ گیا۔

ج : کون سا واقعہ؟

س : جماعت سے علیحدگی کے بعد آپ نے کرشن نگر (لاہور) میں رہائش اختیار کی تھی۔ مشقِ سخن کا سلسلہ تو خیر ہمیشہ ہی رہا، لیکن ان دنوں آپ مشقِ سخن کے ساتھ ساتھ کچھ کچھ حکّی کی مشقّت بھی کیا کرتے تھے۔ اس واقعے کا تعلّق اس مشقّت سے ہے۔ ہمارا گھر آپ کے پڑوس ہی میں تھا۔ اُن دنوں آپ ہمارے ڈاکٹر بھی تھے۔ میرا بڑا لڑکا، وہی نورالعظیم جس کا نام سُن کر آپ کبھی کبھی فرماتے تھے: "نام تو بڑا اربردست رکھا ہے!" خیر! میرے بڑے لڑکے کو جب تیز بخار ہو جاتا تو کبھی کبھی عجیب سا دورہ پڑ جاتا تھا۔ ایک روز صبح کے وقت اُسے تیز بخار چڑھا، میں دفتر میں تھا، میری اہلیہ اُسے گود میں اُٹھا کر بھاگم بھاگ آپ کے مطب پہنچی۔ آپ نے معائنے کے بعد دوا دی۔ جب ظہر کی نماز کا وقت ہوا اور آپ مسجد کی جانب نماز کے لیے ہمارے گھر کے آگے سے گذرے تو ہمارے دروازے پر دستک ہوئی۔ میری اہلیہ نے دروازے کی درازوں سے جھانک کر دیکھا تو آپ فرما رہے تھے: "بہن! نور کے جوتے پکڑ لیجیے، یہ مطب ہی میں رہ گئے تھے۔!"

ج : مجھے تو یاد نہیں۔

س : ظاہر ہے خدا کی راہ پر چلنے والے اپنی نیکیاں کب یاد رکھتے ہیں۔

(بشکریہ قومی ڈائجسٹ)

الحمد للہ والمنہ

ڈاکٹر اسرار احمد کے تین اہم خطابات

⊗ عبادتِ ربّ ⊗ فریضۂ شہادت علی النّاس

⊗ فریضۂ اقامتِ دین

مُطالباتِ دین

کے نام سے شائع ہو چکے ہیں!

سفید کاغذ ۱۲۸ صفحات

ھدیہ ۶ روپے

مکتبۂ تنظیمِ اسلامی لاہور

مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

کی ایک اور پیشکش

منکرین حدیث کے پیدا کردہ مغالطوں کے ازالے کی ایک اہم کوشش

یتیم پوتے کا حقِ وراثت

تالیف

سید غلام احمد رضوی

ایڈووکیٹ

بڑے سائز کے ۱۲۰ صفحات، سفید کاغذ پر آفسٹ کی طباعت

قیمت : -/۵ روپے

دعوتِ اسلامی تاریخ کے آئینہ میں

وصی مظہر ندوی

انبیاء علیہم السلام سے لے کر دورِ حاضر تک
دعوت اسلامی کی مختصر تاریخ

جدہ ریڈیو سے ۱۵ نشری تقریروں کا مجموعہ

قیمت چار روپیہ پچاس پیسے

ناشر مکتبہ صلائے عام - جیل روڈ - حیدر آباد (سندھ)

(مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور سے بھی طلب کی جا سکتی ہے!)

ترتیب و تہذیب
محمد یونس ایم اے

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

قسط دوم

قرآن اور آثارِ کائنات

حیات بعد الموت اور آخرت

نظامِ شمسی اور کہکشانی نظام: امکان آخرت اور دلیل توحید

اَفَلَمْ یَنْظُرُوْٓا اِلَی السَّمَآءِ فَوْقَهُمْ كَیْفَ بَنَیْنٰهَا وَ زَیَّنّٰهَا وَمَا لَهَا مِنْ فُرُوْجٍ ○

"اچھا تو کیا انہوں نے کبھی اپنے اوپر آسمان کی طرف نہیں دیکھا؟ کس طرح ہم نے اسے بنایا اور آراستہ کیا، اور اس میں کہیں کوئی رخنہ نہیں ہے!"

یہاں آسمان سے مراد عالمِ بالا ہے جسے انسان شب و روز اپنے اوپر چھایا ہوا دیکھتا ہے۔ جس میں دن کو سورج چمکتا اور رات کو چاند اور بے حد و حساب تارے روشن نظر آتے ہیں۔ جسے آدمی برہنہ آنکھ سے دیکھے تو حیرت طاری ہو جاتی ہے۔ لیکن اگر دوربین لگالے تو ایک وسیع و عریض کائنات اُس کے سامنے آتی ہے جو ناپیداکنار ہے، کہیں سے شروع ہو کر کہیں ختم ہوتی نظر نہیں آتی۔ ہماری زمین سے لاکھوں گنے بڑے عظیم الشان سیارے اس کے اندر گیندوں کی طرح گھوم رہے ہیں۔ ہمارے سورج سے ہزاروں درجہ زیادہ روشن تارے اس میں چمک رہے ہیں۔ ہمارا یہ پورا نظامِ شمسی اس کی طرف ایک کہکشاں (GALAXY) کے کونے میں پڑا ہوا ہے۔ تنہا اسی ایک کہکشاں میں ہمارے سورج جیسے کم از کم تین ارب دوسرے تارے (ثوابت) موجود ہیں، اور اب تک کا انسانی مشاہدہ ایسی ایسی دس لاکھ کہکشانوں کا پتہ دے رہا ہے۔ ان لاکھوں کہکشانوں میں سے ہماری قریب ترین ہمسایہ کہکشاں اتنے فاصلے پر واقع ہے کہ اس کی

روشنی ایک لاکھ چھیاسی ہزار میل فی سیکنڈ کی رفتار سے چل کر دس لاکھ سال میں زمین تک پہنچتی ہے۔ یہ تو کائنات کے صرف اس حصّے کی وسعت کا حال ہے، جو اب تک انسان کے علم اور اس کے مشاہدہ میں آئی ہے۔ خدا کی خدائی کس قدر وسیع ہے، اس کا کوئی اندازہ ہم نہیں کر سکتے۔ ہو سکتا ہے کہ انسان کی معلوم کائنات، اس پوری کائنات کے مقابلے وہ نسبت بھی نہ رکھتی ہو، جو قطرے کو سمندر سے ہے۔ اس عظیم کارگاہِ ہست و بود کو جو خدا وجود میں لایا ہے، اس کے بارے میں زمین پر رینگنے والا یہ چھوٹا سا حیوان ناطق جس کا نام انسان ہے، اگر یہ حکم لگائے کہ وہ اسے مرنے کے بعد دوبارہ پیدا نہیں کر سکتا تو یہ اس کی اپنی عقل کی تنگی ہے۔ کائنات کے خالق کی قدرت اس سے کیسے تنگ ہو جائے گی؟ (ق۔ حاشیہ، تفہیم القرآن جلد چہارم)

اپنی اس حیرت انگیز وسعت کے باوجود یہ عظیم الشان نظامِ کائنات ایسا مسلسل اور مستحکم ہے اور اس کی بندش اتنی چست ہے کہ اس میں کسی جگہ کوئی دراڑ یا شگاف نہیں ہے اور اس کا تسلسل کہیں جا کر ٹوٹ نہیں جاتا۔ اس چیز کو ایک مثال سے اچھی طرح سمجھا جا سکتا ہے۔ جدید زمانے کے ریڈیائی ہیئت دانوں نے ایک کہکشانی نظام کا مشاہدہ کیا ہے جسے وہ منبع ۳ ج (3C 295 SOURCE) کے نام سے تعبیر کرتے ہیں۔ اس کے متعلق ان کا اندازہ یہ ہے کہ اس کی جو شعاعیں اب ہم تک پہنچ رہی ہیں، وہ چار ارب سال سے بھی زیادہ مدّت پہلے اس میں سے روانہ ہوئی ہوں گی۔ اس بعید ترین فاصلے سے ان شعاعوں کا زمین تک پہنچنا آخر کیسے ممکن ہوتا۔ اگر زمین اور اس کہکشاں کے درمیان کائنات کا تسلسل کسی جگہ سے ٹوٹا ہوا ہوتا اور اس کی بندش میں کہیں شگاف پڑا ہوا ہوتا۔ اللہ تعالیٰ اس حقیقت کی طرف اشارہ کر کے دراصل یہ سوال آدمی کے سامنے پیش کرتا ہے کہ میری کائنات کے اس نظام میں جب تم ایک ذرا سے رخنے کی نشاندہی نہیں کر سکتے، تو میری قدرت میں اس کمزوری کا تصوّر کہاں سے تمھارے دماغ میں آگیا کہ تمھارے مہلتِ امتحان ختم ہو جانے کے بعد تم سے حساب لینے کے لئے میں تمھیں پھر زندہ کر کے اپنے سامنے حاضر کرنا چاہوں تو نہ کر سکوں گا۔

یہ صرف امکانِ آخرت ہی کا ثبوت نہیں ہے، بلکہ توحید کا ثبوت بھی ہے۔

چار ارب سال نوری (LIGHT YEAR) کی مسافت سے ان شعاعوں کا زمین تک پہنچنا اور یہاں انسان کے بنائے ہوئے آلات کی گرفت میں آنا صریحاً اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ اس کہکشاں سے لے کر زمین تک کی پوری دُنیا مسلسل ایک ہی مادّے سے بنی ہوئی ہے ایک ہی طرح کی قوتیں اس میں کارفرما ہیں اور کسی فرق و تفاوت کے بغیر وہ سب ایک ہی طرح کے قوانین پر کام کر رہی ہیں۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو یہ شعاعیں نہ یہاں تک پہنچ سکتی تھیں اور نہ ان آلات کی گرفت میں آ سکتی تھیں جو انسان نے زمین اور اس کے ماحول میں کام کرنے والے قوانین کا فہم حاصل کر کے بنائے ہیں۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ایک ہی خدا اس پوری کائنات کا خالق و مالک اور حاکم و مُدبّر ہے۔ (سورۂ قٓ۔ حاشیہ ۔ ۸، تفہیم القرآن جلد پنجم)

انشقاقِ قمر اور قربِ وامکانِ قیامت

اِقْتَرَبَتِ السَّاعَةُ وَانْشَقَّ الْقَمَرُ ۝ (القمر-۱)

"قیامت کی گھڑی قریب آ گئی اور چاند پھٹ گیا!"

یعنی چاند کا پھٹ جانا اس بات کی علامت ہے کہ وہ قیامت کی گھڑی جس کے آنے کی تم لوگوں کو خبر دی جاتی رہی ہے، قریب آ لگی ہے اور نظامِ عالم درہم برہم ہونے کا آغاز ہو گیا ہے۔ نیز یہ واقعہ کہ چاند جیسا ایک عظیم کرہ شق ہو کر دو ٹکڑے ہو گیا، اس امر کا کھلا ثبوت ہے کہ جس قیامت کا تم سے ذکر کیا جا رہا ہے، وہ برپا ہو سکتی ہے۔ ظاہر ہے کہ جب چاند پھٹ سکتا ہے تو زمین بھی پھٹ سکتی ہے، تاروں اور سیاروں کے مدار بھی بدل سکتے ہیں اور افلاک کا یہ سارا نظام درہم برہم ہو سکتا ہے۔ اس میں کوئی چیز ازلی و ابدی اور دائم و مستقل نہیں ہے کہ قیامت برپا نہ ہو سکے۔

معترضین اس پر اعتراض کرتے ہیں کہ ایسا ہونا ممکن ہی نہیں ہے کہ چاند جیسے عظیم کُرے کے دو ٹکڑے پھٹ کر الگ ہو جائیں۔ اور سینکڑوں میل کے فاصلہ تک ایک دوسرے سے دُور جانے کے بعد پھر باہم جڑ جائیں۔ لیکن درحقیقت یہ اعتراض بے وزن ہے۔ جہاں تک اس کے امکان کی بحث ہے۔ قدیم زمانے میں تو شاید وہ چل بھی سکتی تھی۔ لیکن موجودہ دور میں سیاروں کی ساخت کے متعلق انسان کو جو

معلومات حاصل ہوئی ہیں، ان کی بنا پر یہ بات بالکل ممکن ہے کہ ایک کرہ اپنے اندر کی آتش فشانی کے باعث پھٹ جائے، اور اس زبردست انفجار سے اس کے دو ٹکڑے دور تک چلے جائیں، اور پھر اپنے مرکز مقناطیسی قوت کے سبب سے وہ ایک دوسرے کے ساتھ آملیں۔ (سورۃ القمر۔ حاشیہ ۱۔ تفہیم القرآن جلد پنجم)

عالمِ ارضی سے توحید اور حیات بعد الموت پر استدلال

وَهُوَ الَّذِيْ مَدَّ الْاَرْضَ وَجَعَلَ فِيْهَا رَوَاسِيَ وَاَنْهٰرًا ؕ وَمِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ جَعَلَ فِيْهَا زَوْجَيْنِ اثْنَيْنِ يُغْشِي الَّيْلَ النَّهَارَ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ۝ (الرعد-۳)

"اور وہی ہے جس نے یہ زمین پھیلا رکھی ہے، اس میں پہاڑوں کے کھونٹے گاڑ رکھے ہیں اور دریا بہا دیئے ہیں۔ اس نے ہر طرح کے پھلوں کے جوڑے پیدا کئے ہیں، اور وہی دن پر رات طاری کرتا ہے۔ ان ساری چیزوں میں بڑی نشانیاں ہیں، اُن لوگوں کے لئے جو غور و فکر سے کام لیتے ہیں۔"

اجرامِ فلکی کے بعد عالمِ ارضی کی طرف توجہ دلائی جاتی ہے اور یہاں بھی خدا کی قدرت اور حکمت کے نشانات سے انہی دونوں حقیقتوں یعنی توحید اور آخرت، پر استشہاد کیا گیا ہے، جن پر پچھلی آیات میں عالمِ سماوی کے آثار سے استشہاد کیا گیا تھا۔ ان دلائل کا خلاصہ یہ ہے:

(۱) اجرامِ فلکی کے ساتھ زمین کا تعلق، زمین کے ساتھ سورج اور چاند کا تعلق زمین کی بے شمار مخلوقات کی ضرورتوں سے پہاڑوں اور دریاؤں کا تعلق، یہ ساری چیزیں اس بات پر کھلی شہادت دیتی ہیں کہ ان کو نہ تو الگ الگ خداؤں نے بنایا ہے، اور نہ مختلف بااختیار خدا ان کا انتظام کر رہے ہیں۔ اگر ایسا ہوتا تو ان سب چیزوں میں باہم اتنی مناسبتیں اور ہم آہنگیاں اور موافقتیں نہ پیدا ہو سکتی تھیں اور نہ مسلسل قائم رہ سکتی تھیں۔ الگ الگ خداؤں کے لئے یہ کیسے ممکن تھا کہ وہ مل کر پوری کائنات کے لئے تخلیق و تدبیر کا منصوبہ بنا لیتے جس کی ہر چیز زمین سے لے کر آسمانوں تک ایک دوسرے

کے ساتھ جوڑ کھاتی چلی جائے، اور کبھی ان کی مصلحتوں کے درمیان تصادم نہ ہونے پائے۔

(۲) زمین کے اس عظیم الشان کُرّے کا فضائے بسیط میں معلق ہونا، اس کی سطح پر اتنے بڑے بڑے پہاڑوں کا ابھر آنا، اس کے سینے پر ایسے ایسے زبردست دریاؤں کا جاری ہونا، اس کی گود میں طرح طرح کے بے حدوحساب درختوں کا پھلنا، اور پیہم انتہائی باقاعدگی کے ساتھ رات اور دن کے حیرت انگیز آثار کا طاری ہونا، یہ سب چیزیں اس خدا کی قدرت پر گواہ ہیں جس نے انہیں پیدا کیا ہے۔ ایسے قادرِ مطلق کے متعلق یہ گمان کرنا کہ وہ انسان کو مرنے کے بعد دوبارہ زندگی عطا نہیں کر سکتا، عقل و دانش کی نہیں، حماقت و بلادت کی دلیل ہے۔

(۳) زمین کی ساخت میں، اس پر پہاڑوں کی پیدائش میں، پہاڑوں سے دریاؤں کی روانی کا انتظام کرنے میں، پھلوں کی ہر قسم میں دو دو طرح کے پھل پیدا کرنے میں، اور رات کے بعد دن، اور دن کے بعد رات باقاعدگی کے ساتھ لانے میں جو بے شمار حکمتیں اور مصلحتیں پائی جاتی ہیں۔ وہ پکار پکار کر شہادت دے رہی ہیں کہ جس خدا نے تخلیق کا یہ نقشہ بنایا ہے وہ کمال درجے کا حکیم ہے۔ یہ ساری کی ساری چیزیں خبر دیتی ہیں کہ یہ نہ تو کسی بے ارادہ طاقت کی کارفرمائی ہے اور نہ کسی کھلنڈرے کا کھلونا۔ ان میں سے ہر ہر چیز کے اندر ایک حکیم کی حکمت اور انتہائی بالغ نظری کام کرتی نظر آتی ہے۔ یہ سب کچھ دیکھنے کے بعد صرف ایک نادان ہی ہو سکتا ہے جو یہ گمان کرے کہ زمین پر انسان کو پیدا کر کے اور اسے ایسی ہنگامہ آرائیوں کے مواقع دے کر وہ اس کو یونہی خاک میں گم کر دے گا۔

(سورہ الرعد۔ حاشیہ ۸ تفہیم القرآن جلد دوم)

ساری زمین کو اس نے یکساں بنا کر نہیں رکھ دیا ہے، بلکہ اس میں سے بے شمار خطّے پیدا کر دیئے ہیں، جو متّصل ہونے کے باوجود شکل میں، رنگ میں، مادّۂ ترکیب میں، خاصیتوں میں، قوّتوں اور صلاحیتوں میں، پیداوار اور کیمیاوی، یا معدنی خزانوں میں ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ ان مختلف خطّوں کی پیدائش اور ان کے اندر طرح طرح کے اختلافات کی موجودگی اپنے اندر اتنی حکمتیں اور مصلحتیں رکھتی ہے کہ اُن کا شمار نہیں ہو سکتا۔ دوسری مخلوقات سے قطع نظر، صرف ایک انسان

ہی کے مفاد کو سامنے رکھ کر دیکھا جائے تو اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ انسان کی مختلف اغراض و مصالح اور زمین کے ان خطّوں کی گوناگونی کے درمیان جو مناسبتیں اور مطابقتیں پائی جاتی ہیں، اور ان کی بدولت انسانی تمدّن کو پھلنے پھولنے کے جو مواقع بہم پہنچے ہیں۔ وہ یقیناً کسی حکیم کی فکر اور اس کے سوچے سمجھے منصوبے اور اس کے دانشمندانہ ارادے کا نتیجہ ہیں۔ اسے محض ایک اتفاقی حادثہ قرار دینے کے لئے بڑی ہٹ دھرمی درکار ہے۔

(سورہ الرّعد۔ حاشیہ ۹ تفہیم القرآن جلد دوم)

اٹامک انرجی، سیکنڈ لاء آف تھرموڈائنامکس اور قیامت

مَا خَلَقَ اللّٰهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَآ اِلَّا بِالْحَقِّ وَاَجَلٍ مُّسَمًّى ؕ (الرّوم-۸)

"اللہ نے زمین اور آسمانوں کو اور اُن ساری چیزوں کو جو اُن کے درمیان ہیں برحق اور ایک مقرّر مدّت ہی کے لئے پیدا کیا ہے!"

دوسری حقیقت جو اس کائنات کا مطالعہ کرنے سے صاف نظر آتی ہے وہ یہ ہے کہ یہاں کسی چیز کے لئے بھی ہمیشگی نہیں ہے۔ ہر چیز کے لئے ایک عمر مقرّر ہے، جسے پہنچنے کے بعد وہ ختم ہو جاتی ہے۔ اور یہی معاملہ بحیثیتِ مجموعی پوری کائنات کا بھی ہے۔ یہاں جتنی طاقتیں کام کر رہی ہیں، وہ سب محدود ہیں، ایک وقت تک ہی کام کر رہی ہیں اور کسی وقت پر انہیں لامحالہ خرچ ہو جانا اور اس نظام کو ختم ہو جانا ہے۔ قدیم زمانے میں تو علم کی کمی کے باعث ان فلسفیوں اور سائنسدانوں کی بات کچھ چل بھی جاتی تھی، جو دنیا کو ازلی و ابدی قرار دیتے تھے۔ مگر موجودہ سائنس نے عالم کے حدوث و قِدم کی اس بحث میں، جو ایک مدّت دراز سے دہریوں اور خدا پرستوں کے درمیان چلی آ رہی تھی۔ قریب قریب حتمی طور پر اپنا وزن خدا پرستوں کے حق میں ڈال دیا ہے۔ اب دہریوں کے لئے عقل اور حکمت کا نام لے کر یہ دعویٰ کرنے کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہی ہے کہ دنیا ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گی اور قیامت کبھی نہ آئے گی۔ پرانی مادّہ پرستی کا سارا انحصار اس تخیّل پر تھا کہ مادّہ فنا نہیں ہو سکتا

صرف صورت بدلی جاسکتی ہے۔ مگر ہر تغیر کے بعد مادّہ، مادّہ ہی رہتا ہے اور اُس کی مقدار میں کوئی کمی و بیشی نہیں ہوتی۔ اس بنا پر یہ نتیجہ نکالا جاتا تھا کہ اس عالمِ مادّی کی نہ کوئی ابتدا ہے نہ انتہا۔ لیکن اب جوہر توانائی (ATOMIC ENERGY) کے انکشاف نے اس پورے تخیّل کی بساط الٹ کر رکھ دی ہے۔ اب یہ بات کھل گئی ہے کہ قوّت مادّے میں تبدیل ہوتی ہے، اور مادّہ پھر قوّت میں تبدیل ہو جاتا ہے، حتّٰی کہ نہ صورت باقی رہتی ہے نہ ہیولیٰ۔ اب حرکیاتِ حرارت کے دوسرے قانون (SECOND LAW OF THERMODYNAMICS) نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ عالمِ مادّی نہ ازلی ہو سکتا ہے نہ ابدی۔ اس کو لازماً ایک وقت شروع اور ایک وقت ختم ہونا ہی چاہیئے۔ اس لئے سائنس کی بنیاد پر اب قیامت کا انکار ممکن نہیں رہا ہے۔ اور ظاہر بات ہے کہ جب سائنس ہتھیار ڈال دے تو فلسفہ کن ٹانگوں پر اُٹھ کر قیامت کا انکار کرے گا؟ (سورۂ روم۔ حاشیہ ۶)

ایک صاحب کے استفسار پر فرماتے ہیں:

حرکیاتِ[1] حرارت کے دوسرے قانون کو جن الفاظ میں سائنس کی کتابوں میں بیان کیا گیا ہے، ان میں آپ نے یہ مضمون تلاش کرنے کی کوشش کی کہ "یہ عالم مادّی نہ ازلی ہو سکتا ہے نہ ابدی!" اور ظاہر بات ہے کہ یہ مضمون آپ کو کسی کتاب سے نہ مل سکتا تھا۔ اس لئے کہ دراصل یہ تو ایک نتیجہ ہے جو اس قانون سے نکلتا ہے نہ کہ اصل قانون یہی ہو کہ یہ کائنات ازلی و ابدی نہیں ہے۔ آپ براہِ کرم اس قانون پر غور کریں۔ اس کی رُو سے جو حرارت گرم تر سے سرد تر کی طرف منتقل ہوتی ہے، وہ پھر کبھی اپنے اصل منبع کی طرف واپس نہیں جاتی، بلکہ سرد سے سرد تر کی طرف منتقل ہوتی چلی جاتی ہے۔ یہاں تک کہ حرارت کا اصل منبع اس درجۂ حرارت پر آجاتا ہے جس پر اس سے متصل کم حرارت رکھنے والے اجسام کا ہو۔ اور اس منبع سے مزید حرارت حاصل ہونے کا کوئی امکان نہیں رہتا، اِلّا یہ کہ کہیں خارج سے اس میں مزید حرارت بہم پہنچانے کا انتظام کیا جائے۔ یہی چیز اس بات کو ثابت کرتی ہے کہ کائنات میں جو بھی منبعِ حرارت ہے، وہ مسلسل حرارت منتقل کرتا چلا جا رہا ہے اور کوئی حرارت اس کی طرف واپس نہیں جا رہی۔ اس طرح یہ منبع آخر کار ایک روز حرارت سے خالی ہو جائے گا۔

---

[1] مکاتیب سید ابوالاعلیٰ مودودی حصّہ دوم، مکتوب نمبر ۳۔

زمین پر پانی کی مقدار۔ توحید و آخرت پر استدلال

اَللّٰهُ الَّذِیْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَنْعَامَ لِتَرْكَبُوْا مِنْهَا وَمِنْهَا تَاْكُلُوْنَ ۝ وَلَكُمْ فِيْهَا مَنَافِعُ وَلِتَبْلُغُوْا عَلَيْهَا حَاجَةً فِیْ صُدُوْرِكُمْ وَعَلَيْهَا وَعَلَى الْفُلْكِ تُحْمَلُوْنَ ۝ وَيُرِيْكُمْ اٰيٰتِهٖ فَاَیَّ اٰيٰتِ اللّٰهِ تُنْكِرُوْنَ ۝

"اللہ ہی نے تمھارے لیے یہ مویشی جانور بنائے ہیں تاکہ ان میں سے کسی پر تم سوار ہو اور کسی کا گوشت کھاؤ۔ اُن کے اندر تمھارے لئے اور بھی بہت سے منافع ہیں۔ وہ اس کام بھی آتے ہیں کہ تمھارے دلوں میں جہاں جانے کی حاجت ہو وہاں تم ان پر پہنچ سکو، ان پر بھی اور کشتیوں پر بھی تم سوار کیے جاتے ہو۔ اللہ اپنی یہ نشانیاں تمھیں دکھا رہا ہے، آخر تم اس کی کن کن نشانیوں کا انکار کرو گے؟"

مطلب یہ ہے کہ اگر تم محض تماشا دیکھنے اور دل بہلانے کے لئے معجزے کا مطالبہ نہیں کر رہے ہو، بلکہ تمھیں صرف یہ اطمینان کرنے کی ضرورت ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جن باتوں کو ماننے کی دعوت تمھیں دے رہے ہیں (یعنی توحید و آخرت) وہ حق ہیں یا نہیں، تو اس کے لئے خدا کی یہ نشانیاں بہت کافی ہیں، جو ہر وقت تمھارے مشاہدے اور تجربے میں آ رہی ہیں۔ حقیقت کو سمجھنے کے لئے ان نشانیوں کے ہوتے کسی اور نشانی کی کیا حاجت رہ جاتی ہے۔ یہ معجزات کے مطالبے کا تیسرا جواب ہے یہ جواب بھی اس سے پہلے متعدد مقامات پر قرآن میں دیا گیا، اور ہم اس کی تشریح اچھی طرح کر چکے ہیں۔ (جلد اوّل الانعام ۲۶، ۲۴ — جلد دوم یونس ۱۰۵۔ الرعد ۱۵ تا ۲۰ جلد سوم الشعراء ۳، ۴، ۵)

زمین پر جو جانور انسان کی خدمت کر رہے ہیں، خصوصاً گائے، بیل، بھینس، بھیڑ، بکری، اونٹ اور گھوڑے، ان کو بنانے والے نے ایسے نقشے پر بنایا ہے کہ یہ بآسانی انسان کے پالتو خادم بن جاتے ہیں اور ان سے اس کی بے شمار ضروریات پوری ہوتی ہیں۔ اُن پر سواری کرتا ہے، ان سے بار برداری کا کام لیتا ہے، انہیں کھیتی باڑی کے کام میں استعمال کرتا ہے، اُن کا دودھ نکال کر اسے پیتا بھی ہے اور اس سے دہی

لسی، مکھن، کھویا، پنیر اور طرح طرح کی مٹھائیاں بناتا ہے، ان کا گوشت کھاتا ہے، ان کی چربی استعمال کرتا ہے، ان کی اُون اور بال اور کھال اور آنتیں اور ہڈی اور خون اور گوبر، ہر چیز اس کے کام آتی ہے۔ کیا یہ اس بات کا کھلا ہوا ثبوت نہیں ہے کہ انسان کے خالق نے زمین پر اس کو پیدا کرنے سے بھی پہلے اس کی ان بے شمار ضروریات کو سامنے رکھ کر یہ جانور اس خاص نقشے پر پیدا کر دیئے تھے تاکہ وہ ان سے فائدہ اٹھائے۔ (سورۃ المومن۔ حاشیہ ۱۱۰)

پھر زمین کا تین چوتھائی حصہ پانی سے لبریز ہے اور صرف ایک چوتھائی خشکی پر مشتمل ہے۔ خشک حصّوں کے بھی بہت سے چھوٹے اور بڑے رقبے ایسے ہیں جن کے درمیان پانی حائل ہے۔ کرۂ زمین کے ان خشک علاقوں پر انسانی آبادیوں کا پھیلنا اور پھر ان کے درمیان سفر و تجارت کے تعلّقات کا قائم ہونا اس کے بغیر ممکن نہ تھا کہ پانی اور سمندروں اور ہواؤں کو ایسے قوانین کا پابند بنایا جاتا، جن کی بدولت جہاز رانی کی جا سکتی، اور زمین پر وہ سروسامان پیدا کیا جاتا، جسے استعمال کر کے انسان جہاز سازی پر قادر ہوتا۔ کیا یہ اس بات کی صریح علامت نہیں ہے کہ ایک ہی قادرِ مطلق ربّ حکیم و رحیم ہے جس نے انسان اور زمین اور پانی اور سمندروں اور ہواؤں اور ان تمام چیزوں کو جو زمین پر ہیں، اپنے خاص منصوبے کے مطابق بنایا ہے۔ بلکہ اگر انسان صرف جہاز رانی ہی کے نقطۂ نظر سے دیکھے تو اس میں تاروں کے مواقع اور سیاروں کی باقاعدہ گردش سے جو مدد ملتی ہے وہ اس بات کی شہادت دیتی ہے کہ زمین ہی نہیں آسمانوں کا خالق بھی وہی ایک ربّ کریم ہے۔

اس کے بعد اس بات پر بھی غور کیجئے کہ جس خدائے حکیم نے اپنی اتنی بے شمار چیزیں انسان کے تصرف میں دی ہیں اور اس کے مفاد کے لئے یہ کچھ سامان فراہم کیا ہے، کیا بسلامتی ہوش و حواس آپ اس کے متعلق یہ گمان کر سکتے ہیں کہ وہ معاذ اللہ ایسا آنکھ کا اندھا اور گانٹھ کا پورا ہوگا کہ وہ انسان کو یہ سب کچھ دے کر کبھی اس سے حساب نہ لے گا؟

(سورۂ مومن حاشیہ ۱۱۰)

بارش سے مردہ زمین میں نباتات کا اُگنا۔

وَاللّٰهُ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَحْيَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّقَوْمٍ يَّسْمَعُوْنَ ۝ (النحل - ۶۵)

"(تم ہر برسات میں دیکھتے ہو کہ) اللہ نے آسمان سے پانی برسایا اور یکایک مردہ پڑی ہوئی زمین میں اس کی بدولت جان ڈال دی۔ یقیناً اس میں ایک نشانی ہے سننے والوں کے لئے!"

یہ منظر ہر سال تمہاری آنکھوں کے سامنے گذرتا ہے کہ زمین بالکل چٹیل میدان پڑی ہوئی ہے، زندگی کے کوئی آثار موجود نہیں، نہ گھاس پھونس ہے، نہ بیل بوٹے، نہ پھول پتی اور نہ کسی قسم کے حشرات الارض۔ اتنے میں بارش کا موسم آگیا اور ایک دو چھینٹے پڑتے ہی اسی زمین سے زندگی کے چشمے اُبلنے لگے۔ زمین کی تہوں میں دبی ہوئی بے شمار جڑیں یکایک جی اٹھیں اور ہر ایک کے اندر سے وہی نباتات پھر برآمد ہو گئی جو پچھلی برسات میں دیکھے گئے تھے۔ یہ سب کچھ اپنی زندگی میں بار بار تم دیکھتے رہتے ہو۔ اور پھر بھی تمھیں نبی کی زبان سے یہ سُن کر حیرت ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ تمام انسانوں کو مرنے کے بعد دوبارہ زندہ کرے گا۔ اس حیرت کی وجہ اس کے سوا اور کیا ہے کہ تمھارا مشاہدہ بے عقل حیوانوں کا سا مشاہدہ ہے۔ تم کائنات کے کرشموں کو تو دیکھتے ہو، مگر ان کے پیچھے خالق کی قدرت اور حکمت کے نشانات نہیں دیکھتے۔ ورنہ یہ ممکن نہ تھا کہ نبی کا بیان سن کر تمھارا دل نہ پکار اٹھتا کہ فی الواقع یہ نشانیاں اس کے بیان کی تائید کر رہی ہیں۔

(سورہ النحل - حاشیہ الف ۵۳، تفہیم القرآن جلد دوم)

نبی کہتا ہے تم مرنے کے بعد دوبارہ اٹھائے جاؤ گے۔ تم اسے ایک انہونی بات قرار دیتے ہو، مگر زمین ہر بارش کے ہر موسم میں اس کا ثبوت فراہم کرتی ہے کہ اعادۂ خلق نہ صرف ممکن ہے، بلکہ روز تمھاری آنکھوں کے سامنے ہو رہا ہے۔ (حاشیہ ۵۹)

حیات بعد الموت کا اثبات

وَمِنْ اٰيٰتِهٖۤ اَنْ خَلَقَكُمْ مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ اِذَاۤ اَنْتُمْ بَشَرٌ

تَنْتَشِرُوْنَ ۝ (الروم - ۲۰)

"اُس کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ اُس نے تم کو مٹی سے پیدا کیا۔ پھر یکایک تم بشر ہو کر (زمین میں) پھیلتے چلے جا رہے ہو!"

جو خدا ہر آن تمھاری آنکھوں کے سامنے یہ کر رہا ہے، وہ آخر انسان کو مرنے کے بعد دوبارہ زندگی بخشنے سے عاجز کیسے ہو سکتا ہے۔ وہ ہر وقت انسانوں، اور حیوانات میں سے فضلات (WASTE MATTER) خارج کر رہا ہے۔ جن کے اندر زندگی کا شائبہ تک نہیں ہوتا۔ وہ ہر لمحے بے جان مادّے (DEAD MATTER) کے اندر زندگی کی روح پھونک کر بے شمار جیتے جاگتے حیوانات، نباتات اور انسان وجود میں لا رہا ہے۔ حالانکہ بجائے خود ان مادّوں میں، جن سے ان زندہ ہستیوں سے جسم مرکّب ہوتے ہیں، قطعاً کوئی زندگی نہیں ہوتی۔ وہ ہر آن یہ منظر تمھیں دکھا رہا ہے کہ بنجر پڑی ہوئی زمین کو جہاں پانی میسّر آیا، اور یکایک وہ حیوانی اور نباتی زندگی کے خزانے اگلنا شروع کر دیتی ہے۔ یہ سب کچھ دیکھ کر بھی اگر کوئی شخص یہ سمجھتا ہے کہ اس کارخانۂ ہستی کو چلانے والا خدا انسان کے مرجانے کے بعد اسے دوبارہ زندہ کرنے سے عاجز ہے تو حقیقت میں وہ عقل کا اندھا ہے۔ اس کے سر کی آنکھیں جن ظاہری مناظر کو دیکھتی ہیں، اس کی عقل کی آنکھیں ان کے اندر نظر آنے والے روشن حقائق کو نہیں دیکھتیں: - اِنَّا خَلَقْنٰهُمْ مِّنْ طِيْنٍ لَّازِبٍ ۝ (سورۃ الصّٰفّٰت - ۱۱) "اُن کو تو ہم نے لیسدار گارے سے پیدا کیا ہے!"

یعنی یہ انسان کوئی بڑی چیز تو نہیں ہے، مٹی سے بنایا گیا ہے اور پھر اسی مٹی سے بنایا جا سکتا ہے۔ لیسدار گارے سے انسان کی پیدائش کا مطلب یہ بھی ہے کہ انسان اوّل کی پیدائش مٹی سے ہوئی تھی، اور پھر آگے نسلِ انسانی اس پہلے انسان کے نطفے سے وجود میں آئی۔ اور یہ بھی ہے کہ ہر انسان لیسدار گارے سے بنا ہے۔ اس لئے کہ انسان کا سارا مادّہ وجود زمین ہی سے حاصل ہوتا ہے۔ جس نطفے سے وہ پیدا ہوا ہے، وہ غذا سے بنتا ہے۔ اور استقرارِ حمل کے وقت سے مرتے دم تک اس کی پوری ہستی جن اجزاء سے مرکّب ہوتی ہے، وہ سب ہی غذا سے فراہم ہوتے ہیں۔ یہ غذا خواہ حیوانی ہو یا نباتی، آخر کار اس کا ماخذ وہ مٹی ہے جو پانی کے ساتھ مل کر اس قابل

ہوتی ہے کہ انسان کی خوراک کے لئے غلّے اور ترکاریاں اور پھل نکالے، اور ان حیوانات کو پرورش کرے جن کا دودھ اور گوشت انسان کھاتا ہے۔

پس بنائے استدلال یہ ہے کہ مٹی اگر حیات قبول کرنے کے لائق نہ تھی تو تم آج کیسے زندہ موجود ہو؟ اور اگر اس میں زندگی پیدا کئے جانے کا آج امکان ہے جیسا کہ تمہارا موجود ہونا خود اس کے امکان کو صریح طور پر ثابت کر رہا ہے، تو کل دوبارہ اس مٹی سے تمہاری پیدائش کیوں ممکن نہ ہوگی؟ (سورۃ الرّوم۔ حاشیہ ۲۵۔ جلد سوم)

بارش کا نظام۔ حیات بعد الموت پر استدلال

وَالذّٰرِيٰتِ ذَرْوًا ۝ فَالْحٰمِلٰتِ وِقْرًا ۝ فَالْجٰرِيٰتِ يُسْرًا ۝ فَالْمُقَسِّمٰتِ اَمْرًا ۝ اِنَّمَا تُوْعَدُوْنَ لَصَادِقٌ ۝ وَّاِنَّ الدِّيْنَ لَوَاقِعٌ ۝ (الذّٰریٰت۔ ۱ تا ۶)

"قسم ہے ان ہواؤں کی جو گرد اڑانے والی ہیں، پھر پانی سے لدے ہوئے بادل اٹھانے والی ہیں، پھر سبک رفتاری کے ساتھ چلنے والی ہیں، پھر ایک بڑے کام (بارش) کی تقسیم کرنے والی ہیں۔ حق یہ ہے کہ جس چیز کا تمھیں خوف دلایا جا رہا ہے وہ سچی ہے اور جزائے اعمال ضرور پیش آنی ہے۔!"

منکرین آخرت زندگی بعد موت کو جس بنا پر غیر ممکن سمجھتے ہیں وہ یہ ہے کہ جب ہم مر کر خاک میں رل مل جائیں گے، اور ہمارا ذرّہ ذرّہ جب زمین میں منتشر ہو جائے گا، تو کیسے ممکن ہے کہ یہ سارے منتشر اجزائے جسم پھر اکٹھے ہو جائیں اور ہمیں دوبارہ بنا کھڑا کیا جائے۔ اس شبہ کی غلطی ان چاروں مظاہر کائنات پر غور کرنے سے خود بخود رفع ہو جاتی ہے، جنھیں آخرت کے لئے دلیل کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ سورج کی شعاعیں روئے زمین کے ان تمام ذخائر آب پر اثر انداز ہوتی ہیں جن تک ان کی حرارت پہنچتی ہے۔ اس عمل سے پانی کے بے حد و حساب قطرے اڑ جاتے ہیں اور اپنے مخزن میں باقی نہیں رہتے۔ مگر وہ فنا نہیں ہو جاتے، بلکہ بھاپ بن کر ایک ایک قطرہ ہوا میں محفوظ رہتا ہے۔ پھر جب خدا کا حکم ہوتا ہے تو یہی ہوا ان قطروں کی بھاپ کو سمیٹ لاتی ہے، اس کو کثیف

بادلوں کی شکل میں جمع کرتی ہے۔ ان بادلوں کو لے کر روئے زمین کے مختلف حصّوں میں پھیل جاتی ہے، اور اس طرف سے جو وقت مقرّر ہے ٹھیک اس وقت ایک ایک قطرے کو اسی شکل میں جس میں وہ پہلے تھا، زمین واپس پہنچا رہی ہے۔ یہ منظر جب آئے دن انسان کی آنکھوں کے سامنے گذر رہا ہے، اس بات کی شہادت دیتا ہے کہ مرے ہوئے انسانوں کے اجزائے جسم بھی اللہ تعالیٰ کے ایک اشارے پر جمع ہو سکتے ہیں۔ اور ان انسانوں کو اس شکل میں پھر اٹھا کھڑا کیا جا سکتا ہے۔ جس میں وہ پہلے موجود تھے۔ یہ اجزاء خواہ مٹی میں ہوں یا پانی میں، یا ہوا میں، بہرحال رہتے اسی زمین اور اس کے ماحول ہی میں ہیں۔ جو خدا پانی کے بخارات کو ہوا میں منتشر ہو جانے کے بعد پھر اس ہوا کے ذریعے سے سمیٹ لاتا ہے، اور انہیں پھر پانی کی شکل میں برسا دیتا ہے، اس کے لئے انسانی جسموں کے بکھرے ہوئے اجزاء کو ہوا، پانی اور مٹی میں سے سمیٹ لانا اور پھر سابق شکلوں میں جمع کر دینا آخر کیوں مشکل ہو؟

(سورہ الذّاریات حاشیہ ۔ ۴ تفہیم القرآن جلد پنجم)

اعمال کا ریکارڈ۔ ریڈیو اور ٹی وی سے استدلال

إِذْ يَتَلَقَّى الْمُتَلَقِّيَانِ عَنِ الْيَمِينِ وَعَنِ الشِّمَالِ قَعِيدٌ ۝ مَا يَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ إِلَّا لَدَيْهِ رَقِيبٌ عَتِيدٌ ۝ (قٓ۔ ۱۷، ۱۸)

"(اور ہمارے اس براہِ راست علم کے علاوہ) دو کاتب اس کے دائیں اور بائیں بیٹھے ہر چیز ثبت کر رہے ہیں۔ کوئی لفظ اس کی زبان سے نہیں نکلتا جسے محفوظ کرنے کے لئے ایک حاضر باش نگران موجود نہ ہو!"

یعنی ایک طرف تو ہم خود براہِ راست انسان کی حرکات و سکنات اور اس کے خیالات کو جانتے ہیں۔ دوسری طرف ہر انسان پر دو فرشتے مامور ہیں جو اس کی ایک ایک بات کو نوٹ کر رہے ہیں، اور اس کا کوئی قول و فعل ان کے ریکارڈ سے نہیں چھوٹتا۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ جس وقت اللہ تعالیٰ کی عدالت میں انسان کی پیشی ہوگی، اس وقت اللہ کو خود بھی معلوم ہوگا کہ کون کیا کر کے آیا ہے، اور اس پر شہادت دینے

کے لئے دو گواہ بھی موجود ہوں گے جو اس کے اعمال کا دستاویزی ثبوت لاکر سامنے رکھ دیں گے۔ یہ دستاویزی ثبوت کس نوعیت کا ہوگا، اس کا ٹھیک ٹھیک تصوّر کرنا تو ہمارے لئے مشکل ہے، مگر جو حقائق آج ہمارے سامنے آرہے ہیں، انہیں دیکھ کر یہ بات بالکل یقینی معلوم ہوتی ہے کہ جس فضا میں انسان رہتا اور کام کرتا ہے اس میں ہر طرف اس کی آوازیں، اس کی تصویریں، اور اس کی حرکات وسکنات کے نقوش ذرّے ذرّے پر ثبت ہو رہے ہیں۔ اور ان میں سے ہر چیز کو بعینہٖ انہی شکلوں آوازوں میں دوبارہ اس طرح پیش کیا جا سکتا ہے کہ اصل اور نقل میں ذرّہ برابر فرق نہ ہو۔ انسان یہ کام نہایت ہی محدود پیمانے پر آلات کی مدد سے کر رہا ہے۔ لیکن خدا کے فرشتے نہ ان آلات کے محتاج ہیں نہ ان قیود سے مقیّد۔ انسان کا اپنا جسم اور اس کے گرد و پیش کی ہر چیز ان کی ٹیپ اور ان کی فلم ہے، جس پر ہر آواز اور ہر تصویر کو اس کی نازک ترین تفصیلات کے ساتھ جوں کی توں ثبت کر سکتے ہیں۔ اور قیامت کے روز آدمی کو اس کے اپنے کانوں سے اس کی اپنی آواز میں اس کی وہ باتیں سُنوا سکتے ہیں جو وہ دنیا میں کرتا تھا، اور اس کی اپنی آنکھوں سے اس کے اپنے تمام کرتوتوں کی چلتی پھرتی تصویریں دکھا سکتے ہیں، جن کی صحت سے انکار کرنا اس کے لئے ممکن نہ رہے۔

اِس مقام پر یہ بات بھی اچھی طرح سمجھ لینی چاہیئے کہ اللہ تعالیٰ آخرت کی عدالت میں کسی شخص کو محض اپنے ذاتی علم کی بنا پر سزا نہ دیدے گا، بلکہ عدل کی تمام شرائط پوری کر کے اس کو سزا دے گا۔ اس لئے دنیا میں ہر شخص کے اقوال و افعال کا مکمّل ریکارڈ تیار کرایا جا رہا ہے۔ تاکہ اس کی کارگذاریوں کا پورا ثبوت ناقابلِ تردید شہادتوں سے پورا ہو جائے۔

سورۃ الزلزال آیات ۱ تا ۴ میں فرمایا: "جب زمین اپنی پوری شدّت کے ساتھ ہلا ڈالی جائے گی۔ اور زمین اپنے اندر کے سارے بوجھ نکال کر باہر ڈال دے گی اور انسان کہے گا کہ یہ اس کو کیا ہو رہا ہے، اس روز وہ اپنے (اوپر گذرے ہوئے) حالات بیان کرے گی!" (سورۂ قٓ۔ حاشیہ ۲۱۔ تفہیم القرآن جلد پنجم)

زمین کے متعلق یہ بات کہ وہ قیامت کے روز اپنے اوپر گذرے ہوئے سب حالات اور واقعات بیان کرے گی، قدیم زمانے کے آدمی کے لئے تو بڑی حیران کُن ہوگی

کہ آخر زمین کیسے بولنے لگے گی۔ لیکن آج علوم طبیعی کے انکشافات اور سینما، لاؤڈ اسپیکر، ریڈیو، ٹیلی ویژن، ٹیپ ریکارڈر، الیکٹرانکس وغیرہ ایجادات کے اس دور میں یہ سمجھنا کچھ بھی مشکل نہیں کہ زمین اپنے حالات کیسے بیان کرے گی۔ انسان اپنی زبان سے جو کچھ بولتا ہے اس کے نقوش ہوا میں، ریڈیائی لہروں میں، گھروں کی دیواروں اور ان کے فرش اور چھت کے ذرّے ذرّے میں، اور اگر کسی سڑک یا میدان یا کھیت میں آدمی نے بات کی ہو تو ان سب کے ذرّات میں ثبت ہیں۔ اللہ تعالیٰ جس وقت چاہے ان ساری آوازوں کو ٹھیک اسی طرح ان چیزوں سے دُہروا سکتا ہے۔ جس طرح کبھی وہ انسان کے منہ سے نکلی تھیں۔ انسان اپنے کانوں سے اس وقت سُن لے گا کہ یہ اسکی اپنی ہی آوازیں ہیں، اور اس کے جاننے والے پہچان لیں گے کہ جو کچھ وہ سُن رہے ہیں وہ اسی شخص کی آواز اور اسی کا لہجہ ہے۔ پھر انسان نے زمین پر جہاں جس حالت میں بھی کوئی کام کیا ہے، اس کی ایک ایک حرکت کا عکس اس کے گرد و پیش کی تمام چیزوں پر پڑا ہے اور اس کی تصویر ان پر نقش ہو چکی ہے۔ بالکل گھپ اندھیرے میں بھی اس نے کوئی فعل کیا ہو تو خدا کی خدائی میں ایسی شعاعیں موجود ہیں، جن کے لئے اندھیرا اور اُجالا کوئی معنی نہیں رکھتا، وہ ہر حالت میں اس کی تصویر لے سکتی ہیں۔ یہ ساری تصویریں قیامت کے روز ایک متحرک فلم کی طرح انسان کے سامنے آجائیں گی اور یہ دکھا دیں گی کہ وہ زندگی بھر کس وقت، کہاں کہاں کیا کچھ کرتا رہا ہے۔ (سورۃ الزلزال۔ حاشیہ ۴ تفہیم القرآن جلد ششم)

انبیاء کرام کے طریق دعوت اور نہج انقلاب کے موضوع پر

مولانا امین احسن اصلاحی کی اہم تصانیف

۱۔ **دعوتِ دین اور اس کا طریق کار**

صفحات ۲۱۲، مضبوط جلد اور خوشنما ڈسٹ کور کے ساتھ۔ قیمت فی نسخہ ۱۰/-

۲۔ **اقامتِ دین کے لئے انبیاء کرام کا طریق کار**

صفحات ۲۸، خوشنما کور کے ساتھ۔ قیمت فی نسخہ ۱/۲۵

شائع کردہ: مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن، لاہور

الحمد للہ کہ

مولانا امین احسن اصلاحی

کی دو اہم تصانیف جنکا شدت سے انتظار تھا طبع ہوگئی ہیں!

(۱)

اسلامی ریاست

مشتمل بر

- چند بنیادی مباحث
- شہریت کے حقوق و فرائض
- غیر مسلموں کے حقوق
- اطاعت کے شرائط اور حدود
- کارکنوں کی ذمہ داریاں اور ان کے اوصاف

۱۸ × ۸/۲۲ کے ۳۷۶ صفحات اعلیٰ سفید کاغذ پر آفسٹ کی طباعت

مجلد مع ڈسٹ کور : قیمت -/۲۰

(۲)

پاکستانی عورت

دور اہے پر

صفحات ۱۸۴ : قیمت -/۱۰

شائع کردہ

مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن - لاہور

۳۶ کے، ماڈل ٹاؤن - لاہور (فون: ۳۵۲۶۱۱)

بسلسلہ ساتویں سالانہ

قرآن کانفرنس

حسب ذیل امور نوٹ فرما لئے جائیں :

۱ - افتتاحی اجلاس کا موضوع ' عظمت قرآن ' ، ہو گا ۔ اور دوسرے اجلاس کا موضوع ' اسلامی دستور و قانون اور پاکستان میں اس کا نفاذ ' ، ہو گا ۔

۲ - ۱۹ تا ۲۱ اپریل روزانہ ایک اجلاس عصر اور مغرب کے مابین ہو گا اور دوسرا مغرب تا عشاء ۔

۳ - پہلے اجلاس میں معاشرت و سیاست اور معیشت و اقتصاد کے اہم موضوعات پر قرآن حکیم کی رہنمائی پر مشتمل روزانہ تقریباً تیس منٹ کا ایک مقالہ ہو گا ، تیس منٹ سوالات کے لئے دئے جائیں گے اور تیس ہی منٹ خطبہ صدارت کے لئے ہوں گے ۔

۴ - بعد مغرب مقالات اور تقاریر کا ملا جلا پروگرام ہوگا جو اندازاً دو گھنٹے جاری رہے گا ۔ کسی ایک دن محفل قرأت منعقد ہو گی !

۵ - ۲۱ - اپریل کو صبح بھی ایک اجلاس ہوگا اور اس کا موضوع ہو گا ' علامہ اقبال اور قرآن حکیم ' ۔

۶ - باہر سے تشریف لانے والے حضرات کے قیام و طعام کا انتظام قرآن اکیڈمی ہی میں ہو گا ۔ لیکن ایسے حضرات سے استدعا ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ ۱۰ اپریل تک اپنے ارادے سے مطلع فرمائیں ۔

نیز مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کے جملہ وابستگان نوٹ فرمالیں کہ

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور رجسٹرڈ

سالانہ اجلاس عام منگل ۲۲ اپریل کو بعد نماز عصر قرآن اکیڈمی میں ہوگا !

Regd. L. No. 7360

MONTHLY MEESAQ LAHORE

Vol. 29 | March - April 1980 | No. 3-4

احباب نوٹ فرمالیں !

دارالعلوم دیو بند کے صد سالہ اجلاس کی وجہ سے

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

کی ساتویں سالانہ

قرآن کانفرنس

کے پروگرام میں تبدیلی کی گئی ہے چنانچہ اب یہ کانفرنس ان شاء اللہ

۱۸ تا ۲۱ اپریل ۱۹۸۰ء لاہور میں منعقد ہو گی

اختتامی اجلاس جمعہ ۱۸ اپریل کو نماز جمعہ کے فوراً بعد مسجد دارالسلام باغ جناح میں ہو گا اور دوسرا اسی رات کو نماز عشاء واپڈا آڈیٹوریم یا مسجد شہداء میں۔

باقی تمام اجلاس

قرآن اکیڈمی

واقع ۳۶۔ کے، ماڈل ٹاؤن، لاہور میں منعقد ہوں گے۔

کور کے اندر کا صفحہ بھی ملاحظہ فرمائیں